برِصغیر میں غلامی

(۷۱۲ء ــــــ ۱۸۴۳ء)

(MUSLIM SLAVERY SYSTEM IN INDIA)

کے۔ایس۔لال

مترجم: محمد مظاہر

PDF created with pdfFactory trial version www.pdffactory.com

پیش لفظ

میں نے اپنی کتاب ''The Legacy of Muslim Rule in India'' میں کہا تھا۔''یہاں مناسب نہیں لگتا کہ مسلم غلامی کے نظام کا تفصیلی مطالعہ کیا جائے جو ایک ادارہ تھا جو انوکھا ہونے کے علاوہ نادر بھی تھا۔اس لئے قرون وسطی میں مسلم غلامی کے نظام کا تفصیلی مطالعہ یہاں کیا جاتا ہے۔میں نے مذکورہ کتاب میں یہ بھی کہا تھا'' کہ ہندوستان میں مسلم حکمرانی کے گوشوں اور پوشیدہ روح کو سمجھنے کا بہترین طریقہ۔۔۔یہ ہے کہ ہم مسلم صحایف کا مطالعہ کریں کیونکہ قرون وسطی کے وقائع نگار عموماً مسلم فقہہ کے عالم بھی تھے۔''اپنی تحریروں میں وہ اکثر مقدس کتابوں سے حوالے دیتے تھے تاکہ فاتحین اور بادشاہوں کے افعال کو حق بجانب ثابت کیا جائے۔اس لئے مسلم صحائف کے منابع کے حوالے اس کتاب میں قدرے کثرت سے دیے گئے ہیں جو ایک ایسی سند ہے جس میں مسلم غلامی کو نظری اور عملی دونوں طریقے سے دیکھا گیا ہے۔

کے۔ایس۔لال
۱۰ جنوری ۱۹۹۴ء دلی۔
مترجم: محمد مظاہر۔
۷۔۷۔۲۰۱۲ء۔کراچی

۱: فاضل مورخ نے نہ جانے کیوں یہ نہیں بتایا کہ لوگوں کو کس طرح غلام / کنیز بنایا جاتا تھا۔آیا ان کے ناک کان چھید کر یا ان کے جسموں کو گود یا داغ کر۔
مترجم سے جو ممکنہ غلطیاں سرزد ہوئیں ہیں ان سے صرف نظر کیجئے۔
۲: میرے عزیز سید نظام حیدر نقوی جو ہندستان کی تاریخ اور علم جغرافیہ پر گہری نظر رکھتے ہیں انہوں نے پیرانہ سالی کے باوجود ترجمہ شدہ عبارت پر ناقدانہ نظر ڈالی اور مفید اصلاحات کیں۔اور جناب سلطان مسعود شیخ نے پروف خورنی کا مرحلہ طے کر دیا۔
۳: حوالہ جات کے لئے مطبوعہ کتاب دیکھئے۔ مترجم

PDF created with pdfFactory trial version www.pdffactory.com

تعارف

غلامی ایک ایسے نظام کو کہتے ہیں جس میں کسی فرد کو دیگر افراد کی بطور ملکیت رکھا جائے ۔ یہ نہایت قدیم نظام ہے جو دنیا کے طول وعرض میں پھیلا ہوا تھا۔ غلامی عہد وحشت کی پیداوار ہے جو قدیم تہذیبوں میں بھی جاری رہا۔ جیسا کہ نیبویر کا کہنا ہے۔'' جانوروں کے سدھانے کا فطری نتیجہ یہ نکلا کہ انسانوں کو سدھایا جانے لگا۔'' یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ خانہ بدوش چرواہا جس نے حیوانوں کو سدھایا اسی نے انسان کو بھی سدھانا اور غلام بنانا شروع کر دیا۔ غلامی بابل میں موجود تھی اور میسوپوٹامیہ میں بھی ۔ یہ پراچینی مصر میں رائج تھی اور جناب مسیح کی آمد سے پہلے یونان اور روم میں بھی اس کا دور دورہ تھا غلام خاص طور پر جنگی قیدی ہوتے ،لیکن کنگال مقروض اور سزا یافتہ مجرمین بھی بسا اوقات غلامی کے چنگل میں آجاتے اور مخصوص کاموں کے لئے دھر لئے جاتے ۔ مختلف ملکوں کی قدیم تہذیبیں کئی خاندانی سلطنتوں،عہدوں اور بادشاہوں میں بٹی ہوئی ہیں۔ ہمیں ان کی تفصیلات میں نہ جانا چاہیے۔ اپنے محدود مقصد کے لئے ہمیں قدیم مصر، یونان اور روم وغیرہ میں غلامی کا جائزہ لینا ہوگا اور اسلام کے ظہور تک جب غلامی مذہب اور کلچر کا اٹوٹ حصہ بن گئی اور اسے سماج میں ایک مستقل جگہ مل گئی۔

دوسرے خطوں کی طرح قدیم مصر میں غلام محنت کش قوت مہیا کرتے اور پھر انہیں کسی بھی حیثیت میں ہر قسم کے کام میں لگایا جاتا تھا۔ ۳۰۰۰۔۲۳۰۰ ق م میں انگنت تعداد میں غلاموں کو مصری اہرام کی تعمیر پر لگایا گیا۔ بقول ہیروڈوٹس عظیم اہرام (of cheops) کی تعمیر کے لئے کوئی ایک لاکھ افراد دس برس تک کام کرتے رہے تا کہ ۳۰۰۰ فٹ لمبا نہری پشتہ بنایا جائے تا کہ کانوں سے پتھروں کو پہنچایا جا سکے اور اسی تعداد میں لوگوں کو بیس سال تک لگایا گیا تا کہ اہرام کو مکمل کیا جائے۔ جدید تحقیق کی نظر میں یہ اعداد وشمار مبالغہ آمیز ہیں کیونکہ ہیروڈوٹس نے اپنے سفر میں لوگوں سے پوچھا اور سنی سنائی باتوں پر اعتبار کر لیا۔ اس سلسلے میں جو بات اہم ہے وہ یہ ہے کہ نو اہرام جو آج موجود ہیں ان کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ انہیں مختلف بادشاہوں نے اپنے مقبروں کو بطور یادگار تعمیر کرایا تھا اور جس میں بڑی تعداد میں افرادی قوت لگائی گئی ہوگی۔ مصر میں غلاموں کو دیگر کاموں میں بھی لگایا جاتا تھا۔

اہل یونان میں بھی غلامی کا ادارہ گہری جڑیں رکھتا تھا۔ دو شہری مملکتوں میں جنہیں Poleis کہا جاتا (واحد پولس، معنی شہر اور اس کا ماحول) یعنی ایتھنز اور اسپارٹا میں غلامی کی گرفت حاوی تھی اور اسی طرح دیگر کم معروف ریاستوں میں بھی ۔ پراچینی یونانی سماج تین طبقات میں بٹا ہوا تھا۔ آزاد پیدا ہونے والے شہری۔ تمام مراعات سے لطف اندوز ہوتے اور سیاست میں حصہ لیتے ۔ دوسری قسم غیر ملکیوں پر منحصر تھی۔ انہیں کوئی سیاسی حقوق حاصل نہ تھے لیکن غلام کے مقابلے میں وہ خوش حال تھے کیونکہ بسا اوقات وہ اقتصادی معاملات اپنے ہاتھ میں لے لیتے اور پیادہ فوج میں بھرتی ہو جاتے ۔ تیسری قسم Helots کی تھی جو سب غلام ہوتے ۔ یونان میں کاشتکاروں کی اکثریت زمین کی ملکیت نہ رکھتی اور انہیں زمینداروں کو فصل کا معتدبہ حصہ دینا پڑتا۔ یوں وہ مقروض ہو جاتے ۔ ان کے پاس بطور ضمانت دینے کو کچھ نہ ہوتا اور اس لیے اپنی ذات پیش کر دیتے۔ اس طرح انہیں بطور غلام خرید لیا جاتا۔ یہ ایتھنز کے لئے بتایا جاتا ہے جب کہ ایک ایسا وقت بھی آیا جب ۴۶۰۰۰۰ غلاموں کے مقابلے میں آزاد شہریوں کی تعداد ۲۱۰۰ رہ گئی (۱:۲۲۰) جس کے نتیجے میں ہر آقا لاتعداد عورتوں اور مرد غلاموں کا مالک ہوتا۔ مرد کارکن کانوں اور کھیتوں میں کام کرتے اور غلام عورتیں (کنیزیں) گھروں میں خادمائیں ہو جاتیں۔ وہ سب ہر وہ کام کرتے جن سے آقاوں کو فراغت میسر آ سکے۔ ابتداء میں عبرانی اور اہل یونان غلاموں سے نرمی سے پیش آتے لیکن ہر شہری مملکت میں ایسا نہ تھا۔ ایتھنز میں ان سے نرمی والا برتاؤ ہوتا لیکن اسپارٹا میں کہا یہ جاتا ہے کہ ان سے درشتگی سے پیش آتے ۔ غلام تو خود بے یار و مددگار تھے لیکن ڈراکو کے آئین (۱۲۱، ق م) اور سولون کے قوانین نے ان کی حالت کو سدھارا۔ (۱) وہ اب مملکت کی ملکیت تھے ۔ انہیں اب چند بنیادی حقوق مل گئے ۔ انہیں اب موت کی سزا نہیں دی جا سکتی تھی جب تک مملکت سے اجازت نہ ہو۔ تاہم یونانی غلاموں نے مراعات یافتہ طبقے کو اتنی فراغت مہیا کر دی جس میں انہوں نے سیاست اور سیاسی فلسفہ وضع کر لیا جس کے لئے آج یونان مشہور ہے۔

روم میں بھی غلامی عروج پر تھی ۔ وہاں بھی زرعی اراضی کے بڑے بڑے قطعات چند ہاتھوں میں جمع ہو گئے تھے۔ اور ان زمینوں پر زیادہ تر غلاموں کے غول کام کرتے تھے جب کہ ممتاز شہریوں کے لئے معزز پیشہ جنگ بچا تھا۔ رومی غلام یا تو اسیروں میں سے ہوتے یا ایسے مقروض جو رقم ادا نہ کر سکتے ۔ خرید شدہ غلام بھی ہوتے ۔ مگر روم میں غلاموں کے کوئی حقوق نہ تھے ۔ وہ معمولی سی خطا پر موت کے گھاٹ اتار دیے جاتے ۔ غلاموں کی اتنی افراط تھی کہ آگسٹس کے عہد میں کسی شخص نے اپنی موت پر ۴۰۰۰ غلام ترکے میں چھوڑے ۔ کاشتکاری کے علاوہ غلام متعدد پیشوں میں مصروف کار تھے، دستکاریاں اور دیگر حرفتیں۔ لاتعداد غلام جو زراعت سے وابستہ تھے ان پر نظر رکھنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ اس کے نتیجے میں انہیں آہنی شکنجوں میں کس کر رکھا جاتا۔ ان کی کلائیوں اور ٹخنوں میں لوہے کی کڑیاں ڈالی جاتیں اور انہیں اس وقت بھی نہ کھولا جاتا جب وہ سونے لگتے۔

بہت سے غلاموں کو ایسے کھیل میں استعمال کیا جاتا جن میں کسی خونخوار مرد یا چوپائے سے لڑنا پڑتا۔ ان جنگجوؤں کو گلیڈیٹر کہا جاتا جو یا تو جانوروں سے لڑتے یا ایک دوسرے سے ۔ جس میں موت بھی ہو سکتی تھی اور یہ سب تماشائیوں کی دلبستگی کے لئے ہوتا۔ کچھ غلاموں کو باقاعدہ گلیڈیٹر بنانے کی تربیت دی جاتی ۔ اگر کسی لڑائی میں مغلوب

PDF created with pdfFactory trial version www.pdffactory.com

ہاتھ کا انگوٹھا آسمان کی طرف کردیتے اور اس کے برعکس سے مراد جان بخشی تھی۔ یہ ایک سنگدلی والی تفریح تھی جس میں بے چارے غلام کی جان چلی جاتی۔

کبھی کبھار غلاموں کی بغاوتیں بھی ہوتیں۔ ایک بغاوت ۷۳ ق م میں گلیڈ یٹر سپارٹا کس نے اٹلی میں کی تھی جسے قدرے دشواری سے فرو کیا گیا تاہم کبھی کبھی غلاموں کو آزاد بھی کردیا جاتا اور یہ آزاد کردہ افراد روم میں ایک طبقے کی شکل اختیار کرگئے۔ رومن ایمپائر کے زمانے میں غلاموں کی حالت میں چند بڑی تبدیلیاں بھی دیکھنے میں آئیں۔ آگسٹس سیزر (۶۳ ق م تا ۱۴ مسیح) نے غلاموں کو ایک قانونی حیثیت دی اور آقاؤں کے ہاتھ سے ان کی موت اور حیات کا اختیار سلب کرلیا۔ شہنشاہ کونسٹنٹائن (۲۷۴۔۳۳۷ مسیح) نے ایک قانون بنایا جس کے تحت جب آقا کی جائیداد تقسیم ہوگی تو غلاموں کی تقسیم یوں ہوگی کہ باپ اور بیٹا، شوہر بیوی، بھائی اور بہنوں کو جدا نہیں کیا جاسکے گا۔

کشتی کھینے والے غلام بھی یونان میں ایک عام بات تھی اسی طرح روم میں بالخصوص فرانس میں۔ وہ جنگی جہازوں اور عام جہازوں کو چپو سے چلاتے۔ جہاز کے دونوں جانب تنگ جگہ میں زیادہ سے زیادہ بیس چپو لگے ہوتے۔ ہر چپو کو ایک یا اس سے زیادہ آدمی چلاتے۔ بڑے جہازوں میں ۲۰۰۔۳۰۰ کھینے والے ہر دو جانب ہوتے۔ اس کام میں مجرم یا غلاموں کو جبراً مشقت پر لگایا جاتا۔ غلاموں کو بسا اوقات زنجیروں سے باندھ کر بٹھایا جاتا اور کام میں سستی پر کوڑے برسائے جاتے۔ یورپی بحری تاریخ کے اوراق میں آقاؤں کے ہاتھ ہونے والے ظلم و بربریت کا ذکر یورپ کی قدیم تاریخی کتابوں میں ضرب المثل بن گیا۔

دنیا کے زیادہ تر خطوں پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے جیسے یہ ایک تسلیم شدہ ادارہ ہو اور ہندستانی سماج میں بھی ازل سے موجود ہو۔ رگ وید میں متعدد مقامات میں غلاموں کا حوالہ دیا گیا ہے۔ غلام رشتہ داروں کو بطور تحفہ دیے جاتے۔ حکمران کنیزوں (غلام عورتوں) کو تحفے کے طور پر دیتے۔ یہ تمام غلام محلوں میں خانگی ملازمین کی طرح کام کرتے اور اسی طرح اشرافیہ اور پروہتوں کی مقتدرہ میں کام کرتے۔ غالباً وہ تمام افراد جو قرض نہ چکا سکتے غلامی کے چنگل میں چلے جاتے۔

پراچینی ہندوستانی سماج میں غلاموں کا لحاظ رکھا جاتا۔ ان کی حالت قدیم مصر، یونان اور روم کے غلاموں کے مقابلے میں کہیں بہتر تھی۔ مہاتما بدھ نے اپنے پیروکاروں کو حکم دیا کہ وہ اپنے غلاموں کو بس اتنا ہی کام دیں جتنا وہ آسانی سے انجام دے سکیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ جب غلام بیمار ہوجائے تو آقا پر لازم ہے کہ وہ اس کی ضرورتیں پوری کرے۔ موریہ عہد (۳۰۰ سے ۱۰۰ ق م) تک میں کوتلیہ نے ایسے قانون جاری کئے جن میں بتایا گیا کہ آقا کس طرح غلاموں سے سلوک کریں۔ آقا بلا کسی سبب کے غلام کو سزائیں نہیں دے سکتا۔ اگر کوئی آقا غلاموں سے بدسلوکی کرے گا تو مملکت سزا دے گی۔ اشوک کا فرمان جولاٹ نمبر ۱۱ پر ملا ہے اس میں کہا گیا ہے کہ لوگوں کو غلاموں سے ہمدردی اور لحاظ سے پیش آنا چاہیے۔ قدیم ہندوستان میں غلاموں سے اس نرمی سے سلوک کیا جاتا تھا کہ میگا ستھینیز سا سیاح جو کئی ممالک میں غلاموں سے روا رکھے جانے والے سلوک سے باخبر تھا اسے تو یہاں غلامی سرے سے محسوس ہی نہ ہوئی۔ اس نے لکھا ''تمام ہندوستانی آزاد ہیں۔ ان میں تو کوئی غلام نہیں ہے۔۔۔ یہاں تک کہ وہ غیر ملکیوں تک کو بھی غلام نہیں بناتے۔ اس لئے اس کا سوال نہیں پیدا ہوتا کہ وہ اپنے ہی ملکیوں کو غلام بنائیں۔'' بے شک میگا ستھینیز نہ تو پورے ہندوستان اور نہ ہی ہندوستان کے سارے عہد عتیق کے متعلق دعویٰ کرسکتا تھا۔ غلامی ہندوستان میں وجود رکھتی تھی لیکن اس میں انسانیت بھی موجود تھی۔ ایسی فلسفیانہ اور مذہبی کتب ملتی ہیں جن میں غلاموں کا ذکر ملتا ہے لیکن ان میں سے کسی میں بھی یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ ان سے بے رحمی سے سلوک کیا جاتا تھا۔ ہندوستان میں غلاموں کو اشیائے خرید و فروخت نہیں سمجھا جاتا تھا جن سے منافع کمانا مقصود ہو۔ ہندوستانی معشیت کا دارومدار غلامی پر نہیں تھا۔ قدیمی ہندوستان میں غلاموں کی تعداد مغربی ممالک کے مقابلے میں کہیں کم تھی۔ بھول چوک اپنی جگہ مگر ان سے عموماً نرمی والا سلوک ہی کیا جاتا جو ایک انسان سے ہونا چاہیے۔

اس میں ایک قلم اس وقت لگا جب غلامی کے ادارے کو مسیحیت کے رومن ایمپائر میں اقتدار ملنے سے حلت ملی۔ اس وقت تک انسانی فطرت میں پائی جانی والی بدی کی یہ ایک تخلیق تھی۔ یعنی دوسروں پر غلبہ پانے کی جبلت یا پھر دوسروں کو یوں مصرف میں لانا جس سے ذاتی آرام یا منافع حاصل کرنا مقصود ہو۔ اب یہ حکم ربی تھا کہ مسیحیوں کے خدا نے ساری دنیا اور اس کی دولت اس کے ماننے والوں کو ودیعت کی ہے۔ اور یہ کہ کافروں کو کوئی بھی فطری یا انسانی حقوق حاصل نہیں ہیں۔ اور یہ بھی کہ ماننے والے کفار سے جو چاہیں سلوک کریں۔ قتل کریں انہیں لوٹیں ذلیل کرکے غلام بنالیں یا پھر مدنیت سے خارج کردیں۔ مختصراً غلامی حکم ربی سے ایک ادارہ بن گیا۔

جناب مسیحؑ کو غلامی میں کوئی بات قابل اعتراض نہ لگی۔ سینٹ پال کے خیال میں اگر کوئی غلام مسیحی بن جائے تو وہ کسی آزاد کافر سے بہتر تھا۔ چرچ کے فادرز اور پوپ وغیرہ صحایف کی بنیاد پر غلامی کو روا سمجھتے۔ جس سے یہ ہوا کہ غلامی اور بردہ فروشی یورپ اور مسیحی ممالک میں رومن لادینیت کے خاتمے کے بعد پندرہ سو برس تک جاری ساری رہی۔ قرون وسطی میں مسیحی خانقاہیں بلاتکلف غلاموں کی ایک معقول تعداد رکھتی تھیں تاکہ ان کے باغات اور فارم پھلتے پھولتے رہیں۔ مسیحی اقوام مسلم بردہ فروشی میں سترہویں اور اٹھارہویں صدی میں اہم حصے دار تھیں۔ جب غلاموں کی تجارت اپنے عروج پر تھی۔ بہت سے عیسائی چرچ (فرقے) کھلم کھلا غلامی کی حمایت پر امریکہ میں ہونے والی خانہ جنگی (۱۸۶۱ء۔۱۸۶۵ء) تک کمربستہ رہے۔

اس کے باوجود یہ اسلام کے کھاتے میں ڈال دیا جاتا ہے کہ اس کے بینر تلے بردہ فروشی کا آغاز ہوا جسے دیگر کاروبار کی طرح منافع کے لئے چلایا گیا۔ رسول اللہؐ مروج عرب روایت کو قبول کرکے غلام بناتے اور ایک نظیر قائم کردی جب انہوں نے مدینہ کی چند یہودی عورتیں اور بچے مصر روانہ کئے تاکہ ان کے عوض گھوڑے اور اسلحہ حاصل کیا جاسکے۔ ''قرآن'' نے بالصراحت مسلمانوں کو اجازت دی کہ وہ فتوحات کے ذریعے غلام حاصل کریں۔ کیونکہ ہر مسلم عرب اس مال غنیمت میں حصے دار ہوتا۔ جو جنگوں میں ملتا جس میں غلاموں کے علاوہ مرغوب اشیاء اور کفار کی بیویاں ہوتیں یہ سب مشمولات میں تھا اگرچہ رسول اللہؐ نے اس کی ہمت افزائی نہیں کی تھی۔ مذہبی بنیاد پر جنگ کا حکم تھا اور یوں وہ اسلام کی جزو لازم بن گئی۔ ''جنگ کا تمہیں حکم دیا جاتا ہے چاہے یہ تم کو ناگوار لگے۔ اتفاق سے یہ ہوسکتا ہے کہ تمہیں وہ چیز بری لگے اور وہ اچھی جو تمہارے لئے بری ہے لیکن اللہ خوب جانتا ہے جب کہ تم نہیں جانتے۔''

نبی پاک نے خود بھی زمانہ جنگ اور امن میں غلام بنائے تھے۔ عورتیں اور دیگر قیدیوں کو نجد میں بیچا گیا تھا۔ مسلمان ہونے والے عرب اس بات پر فخر کرتے کہ وہ مرد

PDF created with pdfFactory trial version www.pdffactory.com

غلاموں کا حصول پڑوسی ممالک سے ہونے لگا۔صلیبی جنگوں سے پہلے مسلمان ان غلاموں کو رکھتے جو افریقہ سے سیاہ فام لائے جاتے۔اس کے بعد انہوں نے فرنگ (یورپ) سے آنے والے سفید فام غلام رکھنا شروع کردیے۔جو نہ صرف جنگ بلکہ خرید کر بھی حاصل کئے جاتے۔روم اور مکہ اس تجارت کے بڑے مراکز تھے۔بربری حکومتوں (مراکو،فض،الجیریا،تونس اور طرابلس،شمالی افریقہ) کے مسلمان بھی بحیرہ روم میں سمندری ڈاکے کے ذریعے غلام حاصل کرتے۔

غیر مسلموں کے خلاف جہاد کا تصور یہ تھا کہ ہر مسلمان جنگ سے ہونے والے مال غنیمت میں حصہ دار تھا جن میں غلاموں کے علاوہ وہ منافع بھی شامل ہوتا جو غلاموں کے فروخت کرنے سے حاصل ہوتا جس سے اسلام میں نیا جوش اور تحریک ملتی کہ اس پر عمل کر کے غلامی سے منافع حاصل ہوگا۔مصر،یونان اور روم میں غلاموں کو سڑکوں کی تعمیر،کان کنی اور زرعی فارموں میں کام کرنے کے واسطے بڑے تسلسل سے بھرتی کیا جاتا۔ان سے بڑی بے رحمی کا سلوک کیا جاتا لیکن ان کے خلاف کوئی مذہبی تعصب نہ تھا۔بلکہ اسلام میں اس کی ہدایت تھی کہ وہ غیر مسلموں کو کسی اور وجہ سے غلام نہ بنائیں بلکہ اس کا سبب صرف یہ ہو کہ وہ مسلمان نہیں ہیں۔اس ساری کاروائی کا نتیجہ یہ نکلا کہ پوری مسلم دنیا میں بڑے پیمانے پر غلاموں کی تجارت ہونے لگی اور بڑی بڑی منڈیاں قائم ہوگئیں۔مسلم دارالحکومت مثلاً مدینہ،دمشق،کوفہ،بغداد،قاہرہ،قرطبہ،بخارا،غزنی،دہلی اور ہندوستان کے بہت سے بڑے شہروں میں غلاموں کی ریل پیل ہوگئی تاکہ تجارت ہو اور بردہ فروش خوب منافع کمائیں۔

الیکز ینڈر گارڈنر جو بعد میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کی فوج میں توپخانے کا کرنل بنا۔وہ (۱۸۱۹ء۔۱۸۲۳ء) چار سال تک وسطی ایشیا کے چپہ چپہ کی سیاحت کرتا رہا۔اس نے غلاموں کو پکڑنے کے لاتعداد واقعات کافرستان میں دیکھے تھے جو ان دنوں افغانستان کا صوبہ تھا جہاں کی زیادہ تر آبادی کفار پر مبنی تھی۔اس نے یہ پایا کہ اس خطے کو ”غربت کی بدترین صورتحال درپیش تھی اور یہ علاقہ بدنصیبی کا گڑھ تھا۔کندز کے بادشاہ کے متواتر دھاوے جو غلاموں کو پکڑنے کے لئے کئے جاتے جنہیں بعد ازاں بلخ اور بخارا کی بردہ منڈیوں میں پہنچا دیا جاتا۔“ وہ لکھتا ہے۔

”یہ ساری مصیبت کندز کے سردار کے جبر و ستم کا نتیجہ ہے جس کا اپنی رعایا کی لوٹ مار سے جی ہی نہیں بھرتا۔وہ آمو دریا کے جنوب کے دیہی علاقے میں ہر سال دھاوا بولتا اور شب خون میں اس کی فوج ہر فرد کو پکڑ لے جاتی جوان کے ہتھے چڑھتا۔اس کے بعد سردار اور اس کے درباری اپنی پسند کے لے لیتے اور باقی ماندہ ترکستان کی منڈی میں فروخت کردیے جاتے۔اس قسم کے سامان تجارت کا اہم مہیا کرنے والا خیوا کا خان تھا۔بخارا کا بادشاہ (جو مسلم عقیدے کا سورما تھا) اور کندز کا ڈاکو بیگ۔“

”بردہ فروشی کی باقاعدہ منڈی میں یا جب سوداگروں میں سودا طے ہوتا تو غلام کے عوض نقد رقم کا دستور تھا جو عموماً بخارا کا سونے والا طلا (جس کی مالیت کمپنی کے ۵ یا ساڑھے پانچ روپے کے برابر) ہوتا۔یا پھر سونے کی سلاخوں یا ذرات کی شکل میں۔یارقند یا پھر چینی سرحد پر زر تبادلہ چینی ٹکسال کا خروپ ہوتا جس کی قیمت کم و بیش ۱۵۰ سے ۲۰۰ روپے تک ہوتی۔مرد غلام کی قیمت حالات کے مطابق ۵ سے ۵۰۰ ہوتی جو گھٹتی بڑھتی۔عورتوں کی قیمت میں بھی کمی بیشی ہوتی رہتی جو ۲ طلا سے لے کر ۱۰۰۰۰ تک ہوسکتی تھی۔یہاں تک کہ انتہائی دی ہوئی قیمت سے دگنی رقم بھی ادا کی گئی۔“

”تاہم اس کاروبار میں ایک معتد بہ حصہ مال کے بدلے مال کے اصول کے تحت بھی طے ہوتا جس کا ثبوت ہمیں پیر نیچہ کی مقدس خانقاہ سے ملے ہیں۔جہاں پر ہم نے دو غلاموں کے بدلے چند بھیڑوں کی چرم وصول کیں! تقدس اور غلاموں کی تجارت کو ترکستان کے علاقے میں ہم شیر و شکر مانے لیتے ہیں۔اور اس لئے جو شخص جتنا پہنچا ہوا ہوگا عموماً اتنے ہی زیادہ خون اور پوست کے سودے طے پائیں گے۔“(3)

الیکز ینڈر گارڈنر کو بعد ازاں ملتان میں ایک پھل فروش ملا” جس کے بیان کی تصدیق اس کے اپنے بھی کھاتے سے ہوئی جس کے مطابق اس نے ایک کنیز کے عوض تین ٹٹو اور سات پشمینے والی اور لال آنکھوں والی بلیاں وصول کیں جنہیں بعد میں اس نے ایک برطانوی کے ہاتھوں فروخت کردیا یہ بات شبہ سے بالاتر ہے کہ وہ خسارے میں رہا ہوگا۔(4)۔اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ہے کہ اسلام کا نظام غلامی ہندو نفسیات کے لئے نفرت انگیز ہوگا کیونکہ یہ ہندو دھرم کے لئے اجنبی تھا اور نظریاتی طور پر بے میل بھی تھا۔

PDF created with pdfFactory trial version www.pdffactory.com

مسلمانوں میں غلامی کے نظام کا آغاز

جس دن سے ہندوستان مسلم حملہ آوروں کا نشانہ بنا اس کے باشندے غول درغول غلام بنائے جانے لگے تاکہ انہیں دساور میں فروخت کیا جائے یا انہیں مختلف حیثیتوں میں چاکری پر لگایا گیا اور ایسے بھی کام جنہیں ملک میں چاکری سے بہتر سمجھا جاتا تھا۔ اس مظہر کو سمجھنے کے لئے یہ لازم ہے کہ ہم اسلام میں غلامی کے نظام فروغ پانے کے ماخذ تک جائیں۔ کیونکہ مسلمان جہاں بھی گئے جن میں زیادہ تر فاتحین تھے یا پھر سوداگران ان خطوں میں غلامی کا ایسا نظام وضع کر کے فروغ دیا گیا جو موسم، فوجی ضرورتوں کا علاقہ ہو یا اس مقام کی رعیت کی مناسبت سے ہو۔ مثلاً جب آٹھویں صدی عیسوی میں محمد بن قاسم نے حملہ کیا بیک وقت عرب اسلام اسی رفتار سے مصر تک پہنچ گیا، شمالی افریقہ کے ساتھ اسپین کے جزیرہ نما پر مغرب میں۔ اسی طرح شام میں بھی اور ایشیائے کوچک، فلسطین، عراق، ایران، خراسان، سستان اور ماوراً النہر تک۔ ان تمام ممالک میں مسلمانوں کا غلامی کا نظام اپنی جگہ بناتا چلا گیا۔ قرون وسطی میں ان ممالک اور ہندوستان کے درمیان ایک مسلسل رابطہ رہا۔ مثال کے طور پر سلطان التمش اور بلبن (۱۲۱۰ء۔۱۲۸۶ء) کے دورِ حکمرانی میں دہلی کے دربار میں منگول آندھی کی وجہ سے عراق خراستان اور ماوراً النہر کے شہزادے اپنے متوسلین کے ہمراہ وارد ہوئے۔ دہلی کی کئی بستیاں اوران کے اطراف و جوانب ان امرا اوران کے غلاموں، سپاہیوں اور علما کا مسکن بن گئے۔ بلبن کے جلوس میں ۵۰۰ سستانی، غوری اور سمرقندی شمشیر برہنہ سپاہ غلام ہوتی۔ جو اس کے دو جانب چلتے جس سے ثابت ہوتا، کہ بدیسی غلاموں کا ایک لشکر تیرہویں چودھویں صدی میں ہندوستان آچکا تھا۔ جب مغلوں نے ہندوستان فتح کرنے کی مہم شروع کی اسی زمانے میں ترکی کی سلطنت عثمانیہ اپنے عروج پر تھی اور اس میں آج کے البانیہ، یونان، بلغاریہ، سربیا، رومانیہ اور دیگر باج گذار ممالک شامل تھے۔ پھر ان ہی دنوں ایران میں صفوی سلطنت موجود تھی۔ عثمانیہ سلطنت کے یورپ سے کاروباری روابط تھے اور درآمدات میں ''ناگزیر حد تک غلاموں کے دستے موجود ہوتے جو سوداگر مہیا کرتے جن میں کچھ یہودی ہوتے جن کا تعلق ورڈم، وینس اور اٹلی سے ہوتا۔ دیگر غلام تاریک افریقہ، مشرقی یورپ اور ترکستان (وسطی ایشیا) سے منگوائے جاتے۔''(3)۔ ہندوستان کے مغل حکمران عثمانی ترکوں اور ایرانی صفوی سلطنتوں سے قریبی مراسم رکھتے۔ اس تعلق میں یقیناً غلاموں اور ان سے متعلق امور کا تبادلہ بھی ہوتا۔ لیکن اس مسئلے میں کسی نوعیت کا گہرا مطالعہ جو نہایت وسیع ہونے کے علاوہ بھول بھلیوں میں داخل ہونے سے کم نہیں۔ اس لئے یہ عین ممکن ہے کہ ہم مرکزی موضوع سے بھٹک جائیں جس کا تعلق محض ہندستاین سے ہے۔ اس لئے ہم خود کو حدود میں مقید رکھیں گے اور اس ادارے کا ہندوستان کے باہر آغاز کس طرح ہوا جو مسلم نظام غلامی کو سمجھنے کے لئے کافی ہوگا اور اسی طرح قرون وسطی کے عرب میں نبی محمدؐ سے پہلے غلامی موجود تھی اور اسے قرآن میں بھی تسلیم کیا گیا ہے۔ اس لئے مسلم نظام غلامی کا سراغ عرب میں لگایا جاسکتا ہے جو مسلمانوں کا مرکزی گھر اور وہ خطہ ہے جہاں سے اسلام پھیلا۔ قرآنی ہدایات اسلامی فتوحات اور مسلم انتظامی اداروں نے اس کو تسلسل اور قانونی جواز مہیا کیا۔ ٹی۔ پی ہیوز کے مطابق ''غلامی کا نظام روح اسلام سے قطعاً ہم آہنگ ہے۔۔۔ جناب رسولؐ نے غلاموں کی حالت سدھاری جیسی کہ عربوں کے بے دین قوانین کے تحت پائی جاتی تھی ہم شک نہیں کر سکتے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ عرب قانون سازا سے ایک مستقل ادارے کی صورت دینے کا عزم رکھتے تھے۔''(4)۔ ڈی ایس مارگولیوتھ اس خیال کو یوں وضاحت کرتا ہے اور اضافہ کرتا ہے کہ ''لے دے کر۔۔۔ رسول مقبولؐ نے کچھ نہ کچھ ضرور کیا جس سے اسیروں کے حالات میں بہتری آئی۔۔۔ انہوں نے یہ بھی حکم دیا کہ اسلام قبول کر لینا بذات خود ایک نیکی ہے۔۔۔ اور کسی غلام کو قتل کرنا یا پاہج بنانے والے کو برابر کی سزا دی جائے (5)۔ انہوں نے الوداعی خطبوں میں سے کسی ایک میں اپنے پیروؤں کو یوں تنبیہ کی' اور تمہارے غلام! لازم سمجھو کہ انہیں ایسا ہی کھلاؤ جیسا کھانا تم خود کھاؤ اور انہیں ویسا ہی پہناؤ جیسا کپڑا تم خود پہنو۔ اور اگر ان سے کوئی غلطی ہو جائے اور تم انہیں معاف نہ کر سکو تو انہیں فروخت کر دو اس لئے کیونکہ وہ خدا کے خدام ہیں اس لئے انہیں آزار نہ پہنچاؤ۔''(6)۔ ان کی حیات طیبہ کے پہلے راسخ العقیدہ مصنف ابن اسحاق نے ایک سودے کا ذکر کیا ہے جس نے بعد ازاں غلاموں کی تجارت میں مسلمانوں کے لئے ایک نظیر کا کام کیا۔ ''تب نبیؐ نے سعد بن زید الانصاری کو چند بنی قریضہ قبیلے کی پکڑی جانے والی کنیزوں کے ہمراہ نجد روانہ کیا تاکہ انہیں فروخت کر کے گھوڑے اور اسلحہ خریدا جا سکے۔''(7)۔ ان عورتوں کو اس وقت پکڑا گیا تھا جب ان کے مردوں کو مدینہ کی منڈی میں بڑی تعداد میں قتل کیا جا چکا تھا۔

اسلام میں غلاموں کی حیثیت:

رسول اللہؐ کے خطبے میں اسلام میں غلاموں کی حیثیت کی بابت چند اساسی تصورات ملتے ہیں۔ اس میں غلام کو آقا کی ملکیت تسلیم کیا گیا ہے۔ غلام کو فروخت کیا جاسکتا ہے۔ جو ایک مسلمان اور اللہ کا بندہ بھی ہوتا ہے اس لئے اس سے درشت رویہ نہ رکھا جائے۔ یہ امر مدنظر رہے کہ ظہور اسلام کے ابتدائی زمانے میں یہ سماج کا خاک نشین حصہ تھا جو محمدؐ کے پرچم تلے جمع ہو گیا تھا اور بازوئے شمشیر زن بن گیا۔ ''قرآن میں بھی اس کا جلی انداز میں یہ کہہ کر اعتراف کیا گیا ہے کہ رسول کے پیرو نچلے طبقے کے لوگ تھے۔''(8)۔ ''عرب اشرافیہ نے رسولؐ سے درخواست کی کہ بحث ومباحثے سے پہلے ان خاک نشینوں کو رخصت کر دیا جائے۔''(9)۔ جیسا سلوک ترک حکمران ہندوستان

PDF created with pdfFactory trial version www.pdffactory.com

ابھرتی۔ جس سے تبدیلی مذہب کی ہمت شکنی ہوتی۔ مذہب کی تبدیلی کے بعد بھی مسلم غلاموں سے بدسلوکی نہیں کی جاسکتی تھی کیونکہ اس سے نئے مذہب پر ضرر رساں اثرات پڑتے اور نیا عقیدہ اختیار کرنے والوں کی زندگی میں ذلت گھل جاتی۔ ان صریح احکام کی بعد ازاں مسلمان فاتحین اور حکمرانوں نے دوسرے ملکوں میں کہاں تک پیروی کی یا منہ چڑایا یہ ایک جدا بات ہے۔ اس دھرتی پر جہاں اسلام کا ظہور ہوا یعنی عرب اس میں تو یہی ہدایت تھی کہ غلاموں سے درشت رویہ نہ رکھا جائے۔ اس کے بجائے آقاؤں کی ہمت افزائی کی جاتی کہ غلاموں کی خدمات سے اچھی طرح فائدہ اٹھایا جائے اور کنیزوں باندیوں سے بے تکلف تعلقات کے ذریعے لطف اندوز ہوا جائے۔ (10)۔

مذکورہ روادار سلوک غیر مشروط نہ تھا۔ کوئی بھی غلام اپنے آقا کی ملکیت ہوتا۔ اس کی حیات مستعار کی مدت آقا طے کرتا۔ مثال کے طور پر وہ آقا کی اجازت کے بغیر شادی نہیں کرسکتا۔ حالانکہ اسے ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کی آزادی تھی لیکن وہ طربیہ محفلیں نہیں برپا کرسکتا تھا اور نہ ہی دوست احباب سے ملنے جاسکتا تھا۔ کوئی غلام نہ تو منصوبہ بناسکتا نہ کسی کو قرض دے سکتا اور نہ ہی حج زیارت کو جاسکتا۔ (11)۔ اگر وہ جتن کرکے جائے داد بنالیتا تو یہ ترکہ میں اس کی اولاد کے بجائے آقا کو ملتی۔ (12)۔ نظری طور پر کوئی غلام اپنی آزادی خرید سکتا لیکن پروانہ آزادی غلام کو اس وقت ملتا جب وہ رقم ادا کردیتا اور جب تک پوری رقم ادا نہ کردی جائے گلوخلاصی نہ ہوتی۔ (13)۔ کوئی غلام اگر اپنے آقا سے فرار ہوجاتا تو اسے بے دینی کا فعل سمجھا جاتا۔ یہ محمدؐ کے احکام تھے۔ (14)۔

زمانہ جاہلیت میں غلاموں کی آزادی کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ زیادہ پرہیزگار عربوں میں یہ ایک عام روایت تھی کہ وہ وصیت میں اپنی موت کے بعد آزاد کرنے کی ہدایت لکھ دیتے۔ رسول کی نظر میں کسی غلام کو آزاد کرنا آقا کا کارِ خیر ہوتا نہ کہ عدل کا تقاضہ اور صاحب ایمان غلام آزادی کا مستحق ہوتا۔

حاصل کلام اسلام میں غلامی ایک مستقل اور پائیدار ادارہ تھا۔ جیسا کہ مارگولیوتھ نے اشارہ کیا ہے۔ ''غلامی کے خاتمے کا خیال نبی کے ذہن میں نہیں آیا تھا۔'' (15) ''حقیقت تو یہی ہے۔'' جیسا کہ رام سوارپ نے لکھا۔ ''محمدؐ نے جہاد کا تصور متعارف کرکے اور غیر مسلموں کو انسانی حقوق سے محروم کرکے انہوں نے غلامی کو اس پیمانے پر مسلط کردیا جس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔۔۔ (علاوہ ازیں) اس بے کنار انداز میں کہ صحابی زبیرؓ کی رحلت کے وقت ان کے ایک ہزار غلام تھے۔ رسولؐ کے پاس کسی وقت ۵۹ غلام تھے اس کے علاوہ ۳۸ نوکر جن میں عورتیں اور مرد دونوں شامل تھے۔ میر خوند پندرہویں صدی عیسوی کا سیرت طیبہ کے مصنف نے ان سب کے نام اپنی کتاب روضہ الصفا میں درج کردیے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ غلامی، باج اور مال غنیمت نئی عرب اشرافیہ کے لئے اہم وسیلہ راحت بن گئی۔۔۔ (16) اسلام میں غلامی کا رشتہ کا تعلق شادی کے رشتے سے چولی دامن کا ہے اسی طرح قانون بیع سے، قانون وراثت اور پورے نظام سے اور اس کی تنسیخ سے ضابطہ اسلام کی بنیاد اور اساس پر ضرب لگ سکتی ہے۔ (17)

مسلم غلامی کی توسیع:

اسلامی غلامی کا نظام فروغ پاتا گیا اور وسعت پذیر رہا جہاں بھی مسلم حکمرانی قائم ہوتی رہی۔ غلام یا قلاّر صفوی عہد کی پیداوار ہے۔ مصر میں مملوک پیدا ہوئے، ترک خلافت میں کاپی کلوس نے جنم لیا۔'' کاپی کولوکو ابتدا میں جنگی قیدیوں میں سے سلطان کے حصے میں سے حاصل کیا جاتا اور بعد میں گاہے بگاہے لگائے جانے والے محصول کے ذریعے (جسے دیشرایم کہا جاتا) جو مسیحی لڑکوں پر عائد کیا جاتا۔ جس کے ذریعے نوجوانوں کی اکثریت جینسری دستوں میں شامل ہوجاتی۔ (18) مسیحی غلام جیورجیا، آرمینیا یا شیر کاسیا کے قیدیوں یا رن کے ورثا میں سے ہوتے۔ (19)۔ سیاہ فام غلام جو مشرقی افریقہ نژاد تھے زنج کہلاتے (20)۔ غلاموں کی اکثیریت جو ہندوستان میں در آئے اور پھلے پھولے وہ ترک تھے۔

اپنے آغاز کے ساتھ ہی اسلام ایک جارحانہ اور توسیع پسندانہ فتوحات پر نکل پڑا۔ اس کے خلفاء نے طول وعرض میں فتوحات حاصل کیں اور اسلام کے ضابطوں کی بنیادوں پر آمرانہ حکومتیں قائم کیں بجائے عوامی خود ارادیت پر قائم جمہوریتوں کے۔ فتوحات کے لئے بڑی افواج درکار ہوتیں، آمرانہ حکومتوں کو نوکرشاہی کے تانتے کے بغیر چلانا دشوار تھا۔ بالخصوص نویں سے تیرہویں صدی عیسوی تک مسلم ایشیا میں بڑی گرم بازاری چل رہی تھی سلطنتیں بنتیں اور مسمار کردی جاتیں شہر بسائے جاتے اور اجاڑے جاتے۔ دوسرے لفظوں میں پورا وسط ایشیا ماورائُ النہر اور ترکستان کا خطہ قرون وسطیٰ میں تہہ وبالا ہورہا تھا۔ فوجوں اور نوکرشاہی کے لئے بہت بڑی تعداد میں نفری درکار تھی تاکہ اسلام کی توسیع پذیر قلمرو معقول انتظام میں رہے۔ اہل ترکی اس کام کے لئے بہ آسانی دستیاب تھے۔

ترک غلام:

بنی عباس نے ایک بہت بڑی سلطنت قائم کرلی تھی جس کا دارالخلافہ بغداد بنا (21)۔ اس کے صوبوں پر ترک غلام افسران حکمرانی کرتے اور ترک کرائے کے فوجی دستگیری کرتے۔ خلیفہ معتصم (۸۳۳ء-۸۴۲ء) نے فوج میں ترک عنصر کو متعارف کرایا اور وہ پہلا خلیفہ تھا جس نے ترک غلاموں کو اپنی ملازمت میں رکھا۔ (22)۔ یہ جلد ہی منکشف ہوا کہ ترکستان اور ماورائُ النہر کے غلام خلیفہ کی افواج کے لئے لاجواب ثابت ہوئے۔ ترک ایک عمومی نام ہے جس میں ہمہ اقسام کے قبیلوں اور متعدد ذاتیں شامل ہیں۔ قدیم مورخین کی نظر میں ترکستان ایک وسیع ملک تھا۔ مشرق میں اس کی سرحد چین تک تھی مغرب میں روم یا ترکی تک شمال میں یاجوج ماجوج کی دیواروں تک اور جنوب میں ہندوستان کا سلسلہ کوہ۔ (23)۔ ترک بطور افراد مہذب اور شہروں کے باسی اور ان کے خانہ بدوش قبیلے صحراؤں کے بیابانوں میں مارے مارے پھرتے۔ مسلم سرحدوں کے شمال اور مغرب میں ایران تک پھیل جانے سے ایک قبیلے کے بعد دوسرا ترکوں، تاتاروں، ترکمین اور یہاں تک کہ منگول اور افغان بھی مطیع ہوگئے۔ ان کی بہادری مہم جوئی کی سرشت نے فاتحین کی توجہ مبذول کرالی۔ انہیں غول درغول غلام بنایا گیا۔ اسلام کے خلیفہ نے بھی ترک غلاموں کو اس لئے خریدا تاکہ دور دراز تک پھیلی ہوئی سلطنت کو

PDF created with pdfFactory trial version www.pdffactory.com

وقت کے ساتھ ان کا استبداد، قانون شکنی اور ان ترکوں کا اقتدار بڑھتا چلا گیا۔(25)۔خلیفہ متوکل کی غیر محتاط اور مذہبی دار و گیر ذیلی نسلوں کی لاتعلقی کی ذمہ دار تھی۔اس کا اپنا بیٹا ان ترکوں سے مل کر سازش میں شریک ہوگیا جس کے نتیجے میں ۸۶۱ء میں خلیفہ قتل کر دیا گیا۔خلیفہ متعدد (۸۹۲ء۔۹۰۲ء) ترکوں کی قوت کو ختم نہ کر سکا۔یوں خلافت کا حتمی انحطاط مقتدر کے ۹۳۲ء میں قتل ہونے کے بعد دبے پاؤں داخل ہوگیا۔''ترک غلام جب چاہتے خلفاء کو قتل کر دیتے۔(26) جیسے ہی خلافت کی سلطنت تیسری صدی ہجری میں منتشر ہوئی تو اس کے صوبائی حکمران خود مختار ہو گئے۔

لیکن تکنیکی طور پر یہ ترک گورنر صاحبان چونکہ غلام تھے یوں ان کا عہد اقتدار عسکری قوت پر قائم ہوتا یا فوجی فتح یابی پر اور اس میں کسی اخلاقی بنیاد کا وجود نہ ہوتا۔جب کہ دوسری جانب خلفاء احترام کا مرکز تھے۔پہلے چار خلفاء تو رسولؐ کے بلاواسطہ رشتہ دار تھے۔معاویہؓ جنہوں نے سلطنت امیہ کی بنیاد رکھی وہ عباسؓ کے عم زاد تھے جو رسول اللہؐ کے چچا تھے۔عباسؓ خود جنہوں نے عباسی سلطنت قائم کی۔اس لئے ترک غلاموں نے اس میں مصلحت دیکھی کہ خلیفہ سے ایک خصوصی تعلق قائم رکھا جائے۔وہ انہیں باقاعدگی سے خراج ادا کرتے رہے اور اپنے حق اقتدار کے لئے ان کی آشیرباد مانگتے رہے۔مرور زمانہ کے ساتھ اس طرح ان کی سیاسی قوت مستحکم ہوگئی۔

PDF created with pdfFactory trial version www.pdffactory.com

عربوں اور ترکوں کے ہاتھوں ہندوؤں کا غلام بننا

ترک کوئی پہلے مسلمان نہ تھے جنہوں نے ہندوستان پر چڑھائی کی ہو۔ ترکوں کے آنے سے پہلے آٹھویں صدی کے آغاز میں مسلمانوں کے سپہ سالار محمد بن قاسم نے سندھ پر دھاوا بولا تھا۔ اور مسلم روایات کے مطابق عربوں نے ایک بڑی تعداد میں ہندوستانیوں کو غلام بنایا تھا۔ بلاشبہ آٹھویں صدی میں محمد بن قاسم کے زمانے سے لے کر اٹھارہویں صدی کے احمد شاہ ابدالی تک، غلام بنانا، ان کی تقسیم اور ہندوستانی جنگی قیدیوں کی خرید وفروخت کا نظام مسلح حملہ آوروں اور حکمرانوں نے بڑے باضابطہ طریقے سے چلایا۔ یہ فطری امر ہے کہ غلام سازی کے ایک ہزار سال کے سفر کو مختصراً ہی بیان کیا جا سکتا ہے جس میں اس نظام کے چند اہم واقعات ہی نمایاں کیے جا سکتے ہیں۔

عربوں کا غلام سازی کا طریقہ:

عربوں کی سندھ پر حملے (۷۱۲ء) میں محمد بن قاسم نے پہلے دیبل پر حملہ کیا۔ یہ لفظ دیول (مندر) سے مشتق ہے۔ یہ جدید کراچی کے قریب ساحل سمندر پر واقع تھا۔ یہاں پر ۴۰۰۰ کشیتر یہ سپاہی اور ۳۰۰۰ برہمن رکھے جاتے تھے۔ سترہ برس کی عمر سے زائد تمام مردوں کو تہہ تیغ کر دیا گیا اور ان کی عورتوں اور بچوں کو غلام بنالیا گیا۔ (1)۔ ۷۰۰ خوش شکل عورتیں جو بدھوں کے معبدوں میں پناہ لئے ہوئے تھیں (یعنی بدھوں کے پگوڈا میں پناہ گیر تھیں) ان سب کو ان قیمتی زیوارات اور ملبوسات کے ساتھ گرفتار کرلیا جن میں جواہرات ٹنکے ہوئے تھے۔ (2)۔ قاسم نے مال غنیمت کا پانچواں حصہ حجاج کو روانہ کر دیا جس میں پچھتر دوشیزائیں شامل تھیں۔ باقی ماندہ چار بٹا پانچ سپاہ میں تقسیم کر دی گئیں۔ (3)۔ اس کے بعد اس نے جن مقامات پر حملہ کیا جیسے ریواڑ، سیہون، ڈھلیلا، برہمن آباد اور ملتان وہاں فوجیوں اور مسلح مردوں کو قتل کر دیا جاتا عام لوگ فرار ہو جاتے اور اگر فرار ممکن نہ ہوتا تو اسلام قبول کر لیتے یا پھر جزیہ ادا کرتے یا پھر اپنے دھرم کے ساتھ مر جاتے۔ بالائی طبقے کی متعدد عورتوں نے آگ میں کود کر جوہر کر لیا۔ اور بہت سی فاتحین کے لئے انعام بن گئیں۔ یہ عورتیں اور بچے غلام بنالئے گئے یا مسلمان ہو گئے اور ان کے دستوں پر دستے یکے بعد دیگرے قسطوں میں خلیفہ کو بھیجے گئے۔ مثلاً جب محمد بن قاسم نے ریواڑ پر قبضہ کر لیا۔ ''وہ وہاں تین روز مقیم رہا اور ۶۰۰۰ مردوں کو قتل کرایا۔ ان کے پیروکاروں، دست نگروں کے علاوہ ان کی عورتوں اور بچوں کو غلام بنالیا گیا'' بعد ازاں ''غلاموں کو گنا گیا تو ان کی تعداد ۶۰۰۰۰ (مرد، عورت، بچے ملا کر) نکلی۔ ان میں تیس جوان خواتین شاہی خاندان کی تھیں۔۔۔ محمد بن قاسم نے ان سب کو حجاج کو روانہ کر دیا'' جس نے انہیں خلیفہ ولید کے پاس بھیج دیا''۔ ''جس نے شاہی نسل کی چند عورتوں کو بیچ ڈالا اور باقی کو دوسروں کو تحفے میں دے دیا''(4)۔ غلاموں کی خرید وفروخت ایک عام بات تھی۔ ''جو ساتویں صدی سے چلتے ہوئے محمد بن قاسم کی مہم (۷۱۲ء۔۷۱۳ء) کے نقطہ عروج تک'' بقول آندرے ونک'' جاٹوں کی ایک قابل ذکر تعداد کو پکڑ کر جنگی قیدی بنالیا گیا اور انہیں عراق اور دیگر علاقوں میں بطور غلام بھیج دیا گیا۔''(5) جاٹ ایک عمومی اصطلاح ہے جو تمام ہندوؤں کے لئے استعمال کی گئی۔ برہمن آباد میں ''یہ بیان کیا جاتا ہے کہ کوئی چھ ہزار جنگجوؤں کو قتل کیا گیا لیکن کچھ راویوں کے مطابق ۱۶۰۰۰ افراد کو قتل کیا گیا۔'' اور ان کے اہل خاندان کو غلامی کا طوق پہنایا گیا۔ (6) ملتان کے شہری قلعے کے پڑاؤ میں سب کو تہہ تیغ کر دیا گیا۔ سرداروں کے کنبے اور ملتان کے جنگجوؤں کو جن کی تعداد کوئی ۶۰۰۰ تھی سب کو غلام بنالیا گیا۔

سندھ میں کوچ کرتی ہوئی فوج ہر مہم میں کنیزیں پکڑ لیتی جنہیں مسلمان بنایا جاتا اور پھر عرب سپاہیوں سے بیاہ دیا جاتا جو منصورہ، کنددار، محفوظہ اور ملتان جیسی نو آبادیوں میں بس جاتے۔ حجاج نے محمد بن قاسم کو مستقل ہدایت یہ دے رکھی تھی ''کفار کہیں چھپنے نہ پائیں ان کی گردنیں تن سے جدا کر دینا۔'' اور عورتوں اور بچوں کو قیدی بنا لینا۔ (7) فتح سندھ کے آخری مراحل میں ''جب لوٹا ہوا مال اور اسیران کو بن قاسم کے سامنے پیش کیا گیا۔۔۔ پانچواں حصہ منتخب کر کے جدا کر کے ایک طرف کر دیا گیا۔ جن کو گنا گیا تو وہ تعداد میں ۲۰۰۰۰ نکلے۔۔۔ (وہ معزز خاندانوں کے تھے) اور ان کے چہروں کو نقاب سے ڈھانپا گیا تھا اور باقی ماندہ سپاہیوں کے حوالے کر دیا گیا۔''(8) بات عیاں ہے کہ عربوں کے سندھ پر حملے میں چند لاکھ عورتیں غلام بنائی گئیں۔

غزنویوں کا ہندوؤں کو پکڑ کر غلام بنانا:

اگر محمد بن قاسم کے مزاج میں سندھیوں کو غلام اور کنیز بنانے والی یہ ''نرمی'' تھی تو محمود غزنی ''جو ایک خونخوار اور سیر نہ ہونے والی طبیعت کا فاتح تھا'' جس کا زمانہ حکومت ۱۰۰۰ء سے شروع ہوتا ہے تو اس کے حساب میں تو لاکھوں ملیں گے۔ ہنری ایلیٹ اور جان ڈارسن نے بڑی چھان پھٹک کر کے اس عہد اور بعد کے ماخذات دیکھے جن میں عتبی کی تاریخ یمنی نظام الدین احمد کی طبقات اکبری اور تاریخ علائی اور خلاصہ التواریخ اس کے بعد یورپ کے محققوں اور عالموں نے بعد میں بھی گہری نظر ڈالی۔ محمد حبیب، محمد ناظم۔ وولزلے ہیگ اور راقم نے خود ان دھاوؤں کا گہری نظر سے مطالعہ کیا۔ (9)۔ تمام شہادتیں اس حقیقت کی جانب اشارہ کرتی ہیں کہ اپنے سترہ حملوں میں محمود غزنوی نے ہندوستان کے بہت سے لوگوں کو غلام بنایا۔ حالانکہ ہم عصر وقائع نگاروں نے ہر مہم میں اسیر بنائے جانے والے افراد کی تعداد نہیں دی ہے، کے باوجود چند معلوم تعداد اور

PDF created with pdfFactory trial version www.pdffactory.com

جب محمود غزنوی نے وے ہند پر (۲۔۱۰۰۱ء) میں حملہ کیا تھا تو اس نے ۵۰۰۰۰۰ دونوں صنفوں کے افراد پکڑے تھے۔ یہ تعداد جو ابونصر محمد عتبی نے دی ہے وہ محمود کا وقایع نگار اور آج کی زبان میں سکریٹری تھا۔ یہ تعداد اتنی ہوشربا ہے کہ الیٹ نے اسے گھٹا کر ۵۰۰۰ مان لیا۔(10)۔قابل توجہ نکتہ تو یہ ہے کہ ہر مہم میں غلام ضرور پکڑے جاتے۔ یہ محض اس وقت ہوتا جب پکڑے جانے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہوتی تب وہ وقایع نویسوں کی توجہ پاتے۔ یہاں تک کہ جب محمود نے پنجاب کے مقام نندونہ پر (۱۰۱۴ء) میں حملہ کیا تو عتبی کا کہنا ہے۔''غلاموں کی اتنی افراط ہوگئی کہ وہ نہایت سستے ہوگئے اور اپنے مالوف وطن (ہندوستان) میں عزت دار لوگ غزنی کے عام دکانداروں کے غلام بن کر بالکل مقید ہوگئے۔(۱۱)۔اس کے بیانات کی بعد کے وقایع نویسوں کی تحریروں میں تصدیق ہوتی ہے جس میں نظام الدین احمد کی طبقات اکبری ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ''محمود کو یہاں بہت سا مال غنیمت اور بڑی تعداد میں غلام ہاتھ آئے۔'' اگلے سال تھانیسر سے بقول فرشتہ کے''مسلم فوج ۲۰۰۰۰۰ غلاموں کو غزنی لائی جس سے یہ شہر ہندوستانی لگتا تھا کیونکہ فوج کے ہر سپاہی کے پاس کئی کئی غلام اور کنیزیں تھیں۔''(12)۔ بعدازاں باران، مہابان، متھرا، قنوج اسّی وغیرہ میں پکڑ کر غلام بنائے گئے۔ جب ۱۰۱۹ء میں محمود غزنی لوٹا تو مال غنیمت میں (بہت سی دولت کے علاوہ) ۵۳۰۰۰ قیدی بھی تھے۔عتبی کہتا ہے کہ''اسیروں کی تعداد کا اس حقیقت سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ہر قیدی ۲ سے ۱۰ درہم میں فروخت ہوا۔انہیں بعد میں غزنی لے جایا گیا اور مختلف شہروں سے انہیں خریدنے کے واسطے سوداگر آئے یہاں تک کہ ماوراالنہر، عراق اور خراسان کے ممالک ان سے اٹ گئے۔'' تاریخ الفی کا مزید بیان ہے کہ سیدوں کا اس میں حصہ ۱۵۰۰۰۰ غلاموں کا تھا یوں غلاموں کی کل تعداد ۷۵۰۰۰۰ بنتی ہے۔(13)

آگے بڑھنے سے پہلے ہمیں دو سوالوں کا جواب دینا ہوگا جو مندرجہ بالا تحقیق سے پیدا ہوئے ہیں۔ پہلا: یہ کیوں کر ممکن ہوتا کہ اتنی بڑی تعداد میں لوگ غلام بنا لیئے جاتے؟ کیا وہ کسی قسم کی مزاحمت نہ کرتے؟ اور دوسرا یہ کہ فاتحین ان اسیروں کے لشکر کیا کرتے تھے؟

ہنگامہ جنگ میں مسلم فوج کے لئے یہ کوئی آسان کام نہ تھا کہ وہ دشمن فوج کو پکڑتے جائیں۔ دشمن تندرست لوگوں پر مشتمل ہوتا جو تنومند بھی ہوتے اور کبھی کبھار وہ راکھشس بھی ہوتے۔ یوں معلوم ہوتا ہے ان مرد قیدیوں کو پکڑنا بڑی مہارت کا کام تھا۔''ماہرین'' ان لوگوں کو گھیرنے کے لئے خصوصی انتظامات کرتے تا کہ ان افراد اور گروہوں کو گھیرا جاسکے۔ان پر کمند یا رسیاں پھینکی جاتیں تا کہ وہ ہلیں نہ جلیں۔ چمڑے کی رسیوں سے باندھ کر انہیں معذور کر دیا جاتا، سن کی بنی ہوئی ڈور، زنجیروں اور شکنجوں سے بھی مدد لی جاتی۔ غیر فوجی پیشہ ور مردوں، عورتوں اور بچے مقابلتاً اس وقت بہ آسانی پکڑ لیئے جاتے جب لڑنے والی سپاہ لڑائی میں ماری جاچکی ہوتی۔صیدوں کو دہشت زدہ کیا جاتا۔ یہ ایک معمول تھا مقتولوں کے سروں کو جمع کر کے مینار بنایا جاتا۔تمام اسیروں کو اس وقت تک باندھ کر رکھا جاتا یہاں تک کہ ان کی ہمت جواب دے جاتی اور ان پر سخت مسلح پہرہ بٹھایا جاتا تب انہیں غلام بنالیا جاتا یا پھر وہ ایمان لے آتے۔انہیں بیچ ڈالا جاتا یا پھر چھوٹے موٹے تمام کاموں میں لگا دیئے جاتے۔

ایک خط میں حجاج نے محمد بن قاسم کو ہدایات دیں کہ مخالفین سے کیسے نمٹا جائے۔قانون میں معاف کرنے کا یہ حکم ہے کہ جب تمہارا کفار سے مقابلہ ہو تو ان کی گردن اڑادو۔۔۔اچھی طرح تہ تیغ کرو (جو بچ رہیں) انہیں کس کر باندھو۔۔۔دشمن کے کسی شخص کو معاف مت کرنا اور کسی کو زندہ نہ چھوڑنا'' وغیرہ وغیرہ۔(14)۔ چند اسیروں کی زندگی بخشی جاسکتی ہے تاہم انہیں رہا نہیں کیا جاسکتا۔ یوں سندھ کے عرب حملہ آواروں نے دیبل میں ہزاروں عورتوں اور مردوں کو غلام بنایا اسی طرح راوڑ میں بھی۔ برہمن آباد میں جب بہت سے لوگ قتل کئے جاچکے۔''تیس سال سے کم عمر کے تمام اسیروں کو زنجیروں میں جکڑ دیا گیا۔۔۔وہ تمام لوگ جو اسلحہ اٹھا کر چل سکتے تھے ان کے سر قلم کر دیے گئے اس کے بعد ان کے پیرو اور متوسلین کو قید کرلیا گیا۔

بالکل اسی طرح غزنی کے محمود نے ۵۰۰۰۰۰''خوبصورت مردوں اور حسین عورتوں کو'' غلام بنایا، یہ وے ہند کے مقام پر نومبر ۱۰۰۱ء میں ۱۵۰۰۰ سپاہ کو ایک''شاندار کارروائی'' میں قتل کرنے کے بعد ہوا۔عتبی ہمیں آگاہ کرتا ہے کہ جے پال جو کابل کا ہندوشاہیہ بادشاہ تھا''اس کی اولادیں اور پوتے پوتیاں، اس کے بھانجے بھتیجے، قبیلوں کے سردار اور اس کے رشتہ داروں سب کو قیدی بنالیا گیا اور انہیں رسیوں سے کس کر باندھا گیا، پھر انہیں سلطان (محمود) کے سامنے پیش کیا گیا جیسے وہ عام سے بدکار لوگ ہوں۔۔۔ان میں سے چند ایک کے ہاتھ ان کی گدیوں میں کس کر بندھے ہوئے تھے، کچھ کو گال سے پکڑ کر لایا گیا تھا اور چند ایک کو گردن پر ضرب لگاتے ہوئے پیش کیا گیا۔(16)۔محمود کی ہر مہم کے بعد بڑے پیمانے پر قتل عام کیا جاتا اس کے بعد غلام سازی کی جاتی۔

''قتل و غارت گری کا ہولناک منظر اسیروں کے چھکے چھڑا دیتا۔اسیروں پر نہ صرف جسمانی تشدد کیا جاتا جس سے ان میں تمیز خیر و شر بھی ختم ہوجاتی۔انہیں بڑے منظّم طریقے سے تحقیر کا نشانہ بنایا جاتا اس کے ساتھ عوامی تمسخر کا بھی سامنا کرنا پڑتا۔ جب سندھ کے قیدیوں کو خلیفہ کی خدمت میں بھیجا گیا''وہ کنیزیں جو زیادہ تر شہزادوں اور راناؤں کی بیٹیاں تھیں تو انہیں ان لوگوں کی قطار میں کھڑا کیا گیا جو کفش برداروں کی قطار تھی (لغوی معنی جوتے اٹھانے والے نیچ)۔(17)۔محمود کے ہاتھوں جے پال کو پہنچنے والی ذلت کی تفصیل ہودی والا بیان کرتا ہے۔وہ رقم طراز ہے کہ جے پال کو شہر خراسان کے مجمع عام میں بردہ فروشی کی منڈی میں پیش کیا گیا بالکل اسی طرح جیسے دیگر ہزاروں ہندو اسیروں کو۔۔۔اسے چہار جانب اسی طرح گھمایا پھرایا گیا تا کہ اس کے بیٹے اور سردار اسے پا بجولاں، توہین آمیز اور شرمناک حالت میں دیکھ لیں۔۔۔تا کہ خلقت کی نظروں میں اس کی ذلت ہو۔۔۔ یوں اس کو سرعام بے توقیری ہو جس میں''وہ عمومی غلامی میں گرا نظر آئے۔''(18) اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں ہے کہ آخر میں جے پال نے اس لئے خودکشی کرلی کیونکہ اسیروں کو جان بوجھ کر اتنا ذلیل کیا جاتا جس سے ان کی عزت نفس ختم ہوجاتی۔ مختصراً اتنی تذلیل کے بعد اسیر چاہے جوان ہو یا بوڑھا بدصورت یا وجیہہ، شہزادہ ہو یا عامی سب ہی پر تازیانے برسائے جاتے تبدیلی مذہب ہوتی یا ٹکے ٹکے میں بکتے یا پھر ارزل کام کرنے مجبور ہوتے۔

یہ دلیل پیش کی جاسکتی ہے کہ محمود غزنی۔۔۔اس لئے لاکھوں باشندوں کو غلام بنا سکا کیونکہ اس کے حملے برق رفتاری سے ہوتے جب کہ مخالفین کی تیاریاں اطمینان بخش نہ ہوتیں۔لیکن اس صورتحال میں جب مسلمانوں کی حالت اتنی مستحکم نہ تھی مثلاً جب محمود کے بیٹے ابراہیم نے ہندوستان پر مہم جوئی کی تو ایک خون ریز مزاحمت اٹھ کھڑی ہوئی لیکن آخر کار ابراہیم ہی فاتح بنا اور بہت سوں کو اس نے قتل کرا دیا۔ وہ لوگ جو فرار ہو کر بچ نکلے جنگلوں میں جا چھپے لیکن ان کے ۱۰۰۰۰۰ بچے اور عورتیں قیدی بنا لئے گئے۔(19) اس بیان میں ہمارے پہلے مسئلے کا خواب پنہاں ہے۔مزاحمت ہوتی اور بر عزم مزاحمت کی جاتی یہاں تک کہ کنبے کے تمام افراد یا گاؤں یا قصبہ حملہ آوروں کا مل جل

PDF created with pdfFactory trial version www.pdffactory.com

سب ہی قید بھی ہو جاتے ۔ وہ ان مصیبت کی گھڑیوں میں بھی ایک دوسرے سے جدا نہ ہوتے ۔ بلاشبہ مصیبت خود ہی انہیں ایک دوسرے سے جوڑ دیتی اس لئے ان کا جینا مرنا ایک ساتھ ہوتا۔

مزید براں پیغمبر محمدؐ ہی کے زمانے سے اور ہدایات کے مطابق جیسا کہ مارگولیوتھ نے لکھا ہے''اسیر ماں کو بچے سے چھڑانے کی ممانعت تھی ۔۔۔اسی طرح بیچتے وقت بھائی کو بھائی سے جدا کرنا منع تھا۔ جب کہ دوسری جانب کوئی بھی شادی شدہ اسیر عورت فی الفور فاتح کی داشتہ بن جاتی ۔(21)اس لئے یہ سہولت کہ اسیروں کو جدا نہ کیا جائے گا بلکہ انہیں یکجا رکھا جائے گا کے پیچھے کوئی انسانی جذبہ کارفرما نہ تھا بلکہ اس سے تعداد بڑھتی جس میں فاتح کا فائدہ تھا۔جس کے باعث بہت بڑی تعداد میں لوگ غلام بن جاتے ۔

اوراب دوسرا سوال آتا ہے ۔کہ یہ فاتحین ان لاتعداد اسیر غلاموں کا کیا کرتے ؟ اولین حملہ آوروں مثلاً محمد بن قاسم اور محمود غزنوی کے زمانے میں انہیں غلاموں کی منڈی میں فروخت کر دیا جاتا جو مسلمانوں کے محکوم علاقوں میں قصبہ قصبہ شہر شہر قائم ہو چکی تھیں ۔ دساور میں بھی غلاموں کو فروخت کرنے میں بہت منافع ہوتا تھا۔اسامی درست تفصیلات دیتا ہے ۔محمد ناظم نے اپنے ایک مقالے میں متعلقہ سطریں اسامی کی نظموں سے ترجمہ کی ہیں ۔''اس (محمود) نے ایک ہی ہلے میں ہندوؤں کی افواج کو منتشر کر دیا ۔(22) ۔اور رائے جے پال کو قید کر لیا۔ وہ اسے اپنی سلطنت کے بعید ترین علاقے غزنی لے گیا اور اسے لے جا کر دلال بازار (غلاموں کی منڈی) کے ایک گماشتے کے حوالے کر دیا۔ میں نے سنا ہے کہ بادشاہ (محمود) کے حکم پر مقیمان بازار (بازار کے دلالوں) نے جے پال کو ۸۰ دینار کے عوض بیچ ڈالا اور سودے میں حاصل شدہ رقم کو خزانے میں جمع کرا دیا۔(23)

جب مسلم حکمرانی ہندوستان میں مستحکم ہو گئی تو اسیروں کی خرید و فروخت محدود ہو گئی ۔ان میں سے کثیر تعداد بادشاہوں اور ان کے امراء کے سرکاری درباری فرائض کی بجا آوری کے لئے ملازم رکھ لئے گئے ۔ جو عمارتوں کی تعمیر میں بطور مزدور کام کرتے جنگلات کاٹتے سڑکیں بناتے اور دیگر کئی کام کرتے ۔اس سب کے باوجود بہت سے بچ جاتے ۔ وہ تمام جو بچ رہتے انہیں ملک کے اندر اور باہر فروخت کر دیا جاتا۔ جہاں غلاموں کی منڈیاں، غلاموں کے سوداگران اور غلاموں کے دلالوں کا کاروبار دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہا ہے اور حکمرانوں کو ان کے منافع میں سے حصہ مل رہا تھا۔

غزنی کے محمود نے ہندوستان پر بارہا حملے کئے تاکہ جہاد کرے اور اسلام پھیلائے ۔ یہاں کی دولت پر ہاتھ صاف کرے، اس کے مندروں کو مسمار کرے، باشندوں کو غلام بنائے انہیں دساور بھیج کر اور منافع کمائے اور اسیروں کو مسلمان بنا کر مسلم آبادی میں اضافہ کر لے۔اس نے یہ بھی چاہا کہ ہندوستان پر اس کی حکومت قائم ہو جائے ۔(24)اس کی سرگرمیاں اتنی متنوع تھیں کہ یہ دشوار ہے کہ اس کی ترجیحات متعین کی جا سکیں۔لیکن اس کا اتنی بڑی تعداد میں اسیران کو لے جانا یہ ظاہر کرتا ہے کہ شاہ غلاماں کے ذہن میں غلام سازی ہر شئے پر مقدم تھی۔ان کی فروخت سے اسے دولت ملتی اور تبدیلی مذہب سے مسلم آبادی میں اضافہ ہو رہا تھا۔

PDF created with pdfFactory trial version www.pdffactory.com

باب ۔۴

ہندوستان کے غلام سلاطین

ان علاقوں میں جہاں اسلام تھا غلامی خوب پھیلی ہوئی تھی ابتدا میں ترک حملہ آور اور ہندوستان کے حکمراں غلام تھے۔ یا پھر ان کی آل اولاد تھے۔غزنی کا محمود ایک خرید کردہ غلام سبکتگین کا بیٹا تھا۔سبکتگین کو بھی الپتگین نے خریدا تھا۔جو خود بھی خرید شدہ غلام تھا۔الپتگین پہلا ترک غلام اور جنگجو حکمران تھا جس نے ہندوستان پر چڑھائی کی تھی۔ اس کا پورا زمانہ اور خوش تدبیری تمام ترک غلاموں کی تاباں علامت ہے۔

الپتگین کو خراسان اور بخارا کے سامانی بادشاہ احمد بن اسماعیل نے خریدا تھا۔سامانی حکمرانوں نے غلاموں کو خرید کر شیرازہ بندی کی روایت عباسی خلفاء سے سیکھی تھی۔وہ کم سن ترک بچوں کو خرید کر انہیں اسلحہ چلانے کی تربیت دلاتے اور مذہبی تعلیم دلاتے وقت گزرنے کے ساتھ ان غلاموں کو مختلف محکموں میں متعین کیا جاتا مگر بنیادی طور پر امرا کے محافظ دستوں میں اور سرحدوں میں بطور پہرے دار ایسا ہی ایک الپتگین بھی تھا۔اس نے ملازمت کا آغاز بطور سرجاندار (ذاتی محافظ) کے کیا اور جلد ہی سرجانداروں کا سربراہ بن گیا۔وہ بہت باصلاحیت اور جری ثابت ہوا اور ابھی پینتیس برس کا تھا کہ اسے سامانی گورنر عبدالملک (۹۵۴ء تا ۹۶۱ء) نے اقطعہ خراسان کا حاکم مقرر کر دیا۔ خراسان کے مقطعہ کی حیثیت میں اس کے ماتحت ۵۰۰ گاؤں اور ۲۰۰۰ ذاتی غلام بھی تھے۔اپنے سرپرست کی ناوقت موت کی وجہ سے وہ غزنی چلا گیا جہاں اس کا باپ سامانی حکمرانوں کے تحت صوبیدار تھا۔غزنی میں وہ کم و بیش، خود مختار سردار کی حیثیت اختیار کر گیا۔(۱)۔اس کی موت پر اس کے متعدد غلام جیسے بالتاگن، پرائے اور سبکتگین وغیرہ غزنی پر حکومت کرتے رہے، مگر ان میں سے آخری الذکر کامیاب ثابت ہوا۔

الپتگین نے نیشاپور میں سبکتگین کو کسی سوداگر ناصر حاجی سے خریدا تھا۔(2) جو اسے ترکستان سے بخارا لایا تھا۔سبکتگین ۹۴۲ء (۳۳۱ھ) میں پیدا ہوا۔اسے بارہ سال کی عمر میں کسی ترک غارت گر نے پکڑ لیا تھا۔(3) الپتگین نے اس کی پرورش کی اور بتدریج اسے اعلیٰ عہدوں پر فائز کیا۔اس نے اپنی بیٹی بھی سبکتگین سے بیاہ دی اور وقت گزرنے کے ساتھ اس کی صلاحیتوں کے اعتراف میں اور اس نفسیاتی ہیبت سے جس سے غلام خود کو آقا سے منوا لیتے تھے اسے امیر الامرا کا خطاب بھی دے دیا جس کا حوالہ جوینی نے دیا ہے۔سبکتگین نے ہند پر متعدد دھاوے جہاد کی نیت سے کئے۔(4) اپنے آقا کی موت کے بعد اس کے امرا نے اسے تخت پر بٹھا دیا۔وہ بسیار مرادوں والا حکمران نکلا۔اپنے ترک اور افغان مصاحبین اور سپاہ کی مدد سے اس نے بخارا کی سامانی قوت پر چڑھائی کر دی اور برس ہا برس تک جاری رہنے والی جنگ وجدل کے بعد وہ اپنے بیٹے محمود کے لئے اس صوبے پر ۹۹۴ء میں کامیاب ہو گیا۔محمود نے سلطان کا لقب اختیار کیا اور اسے خلیفہ وقت نے تسلیم کر لیا۔ہم ہندوستان کی مہموں میں اس محمود سے بار بار ملتے ہیں۔

کوئی دو صدی بعد غوریوں نے غزنویوں سے غزنی چھین لیا۔اس کے عظیم سلطانوں میں سے ایک شہاب الدین تھا (المعروف معیز الدین بن سام اور محمد غوری) بالکل عباسی خلیفہ مستعصم کی طرح جس نے پہلی مرتبہ ترک غلاموں کی ایک کثیر تعداد کو اپنی ملازمت میں رکھا سلطان معیز الدین بن سام غوری بھی اس میں بڑی مسرت محسوس کرتا تھا کہ ترک غلاموں کو خریدے اور انہیں تعلیم سے آراستہ کرے۔(5) موصوف کا کوئی بیٹا نہ تھا جو اس کا وارث تخت بنتا لیکن اس امر نے اس کے لئے کوئی خاص الجھن نہ پیدا کی کیونکہ اسے اپنے غلاموں پر بہت اعتبار تھا اور انہیں وہ پسند بھی کرتا تھا۔منہاج سراج لکھتا ہے کہ کسی موقع پر جب کہ منہ چڑھے درباری نے نرینہ وارث کا سلطان سے ذکر کیا تو اس نے انتہائی اعتماد سے جواب دیا'' دیگر تاجور ممکن ہے ایک یا دو بیٹوں کے باپ ہوں میرے تو کئی ہزار بیٹے ہیں جیسے میرے ترک غلام جو میری اقلیم کے وارث بنیں گے۔اور یہی لوگ اس کے ضامن ہوں گے کہ سلطنت کے طول وعرض میں میرا نام خطبہ میں لیا جائے۔اور ہوا بھی یہی۔ترک غلاموں کی اعانت سے معیز الدین نے ہندوستان میں ایک وسیع سلطنت قائم کی۔اس نے انہیں پہلے بطور حملہ آور کے روانہ کیا اور بعد میں زیر نگیں علاقوں میں بطور صوبیدار اور نایب شاہ کے طور۔

جیسا کہ مذکور ہو چکا ہے۔سلطان معیز الدین کے پاس خرید شدہ ہزاروں غلام تھے جن میں بہت سے خریدے ہوئے بھی تھے۔باقی ماندہ مختلف مہموں میں پکڑے گئے ہوں گے کیونکہ مالی مجبوریاں انہیں خریدنے میں مانع ہوں گی۔ہر اس ترک غلام کی جو کسی اہم مقام پر ممتاز ہوا سب کی بپتا ایک جیسی جوکھم اور پر خطر ہو گی'' حادثات اور گردش زمانہ'' ان میں سے چند ایک حالات ہم عصر اور بعد کے وقائع نگار ضابطہ تحریر میں لے آئے۔یہاں یہ ممکن نہیں ہے کہ ان تمام کا تفصیلاً مطالعہ کیا جائے۔تاہم دو کے شب وروز یعنی ایک بدصورت اور وجیہہ التمش بطور نمونہ ہماری خصوصی توجہ کا مرکز بنیں گے۔

قطب الدین ایبک جو ترقی کر کے ہندوستان کا پہلا غلام سلطان بنا اسے صغر سنی میں فخر الدین نے خریدا تھا جو نیشاپور کا قاضی القضاۃ تھا اور لگتا ہے غلاموں کا ایک بڑا تاجر بھی تھا۔اس کی عنایات اور اس کے بیٹوں کی رفاقت میں ایبک نے قرآن کو باقرات پڑھنا سیکھ لیا اور شہسواری کے علاوہ تیراندازی کی تربیت بھی مل گئی۔ایسی تربیت پر اٹھنے والے اخراجات کو غلاموں کے سوداگروں کی نظر میں (آج کل کی زبان میں) سرمایہ کاری سمجھا جاتا تھا۔تربیت یافتہ غلام کی منڈی میں بہتر قیمت لگتی تھی۔قاضی کی موت کے بعد اس کے بیٹوں نے ایبک کو ایک تاجر کے ہاتھ بیچ ڈالا جو اسے غزنی لے آیا اور اسے سلطان معیز الدین کو فروخت کر دیا۔دیکھنے میں اگرچہ وہ بدصورت تھا تربیت

PDF created with pdfFactory trial version www.pdffactory.com

محافظین کے علاوہ خانہ دار غلام بھی تھے۔"(7) اس طرح اسے ان سب کی انسیت کے علاوہ حمایت بھی حاصل ہوگئی۔اس کے حقدار ہونے سے اسے امیر آخور (اصطبلوں کا حاکم) کے عہدے پر ترقی مل گئی۔اسے ہندوستان میں بھیجی جانے والی مہموں میں بھی تواتر سے روانہ کیا گیا ان فرائض کو اس نے بڑے عزم اور کامیابیوں سے انجام دیا۔ وفاداری اور سلطان معیز الدین کے لئے نمایاں خدمات نے اس کے لئے نایب فرمانروا بننے کی راہ ہموار کردی۔معیز الدین کی خواہشات کے مطابق سلطان کے ایک اور غلام تاج الدین یلدوز نے اپنی بیٹی کی شادی ایبک (8) سے کردی۔ایبک نے ہندوستان میں مسلم مقبوضہ جات میں اضافہ کرنے کی خاطر اپنے آقا کی کئی مہموں میں نیابت کی۔لگتا یہ ہے کہ سلطان کی خواہش ہو کہ ایبک ہندوستان میں اس کا جانشین بنے۔اور پھر سلطان کی موت پر وہ ہندوستان کے شہر لاہور میں ۱۲۰۶ء میں تخت پر بیٹھا اور ۱۲۱۰ء تک حکمرانی کی۔

شمش الدین التمش کا عہد حکومت جس نے (۱۲۱۰-۱۲۳۱ء) تک بطور سلطان حکومت کی وہ زمانہ بڑا رومانٹک اور واقعات سے پر رہا۔وہ ایبک کا ایک خریدا ہوا غلام تھا یوں وہ "ایک غلام کا غلام ہوا" اس کا تعلق دراصل "ترکستان کے خطے سے تھا اور الباری (قبیلے) کا فرد تھا"۔اس کے باپ علم خان کے لاتعداد عزیز و اقارب، رشتے دار، متوسلین اور پیروکار تھے۔التمش اپنی نوعمری سے "خوش شکل، ذہین اور طبیعت کی نیکی سے مالا مال تھا یہاں تک کہ اس کے بھائی اس کی خداداد صلاحیتوں سے حسد کرنے لگے" وہ کسی بہانے اسے والدین سے دور لے گئے اور اسے کسی غلاموں کے تاجر بخارا حاجی کے ہاتھ فروخت کردیا۔تاجر نے اسے اس علاقے کے سب سے بڑے مفتی صدر جہاں کو بیچ ڈالا۔وہ اس ممتاز اور شیخ گھرانے میں پروان چڑھا۔۔۔ جب کہ خاندان والے اسے بچپنے سے اپنے بچوں کی طرح پالتے پوستے رہے۔"بعد میں ایک اور سوداگر جمال الدین محمد نے اسے خرید لیا اور اسے غزنی لے آیا جہاں اس کا حوالہ یہ بنا کہ سلطان معیز الدین نے اس کی تعریف کی تھی۔غزنی میں طویل قیام میں جہاں سوداگر التمش کی بڑی قیمت کی توقع کررہا تھا جو اسے نہ ملی یوں وہ اسے دہلی لے آیا۔التمش کو بطور سپاہ گری کی اچھی تربیت ملی تھی اور اس نے لکھنا پڑھنا بھی سیکھ لیا تھا۔زمانے کے کئی نشیب و فراز دیکھنے کے بعد قطب الدین ایبک نے اسے بڑی قیمت پر خرید لیا۔یہ کہا جاتا ہے کہ معیز الدین نے ایبک سے مخاطب ہو کر یہ کہا "التمش کا خیال رکھنا کیونکہ یہ نامور شخص بنے گا۔"

التمش سب سے پہلے قطب الدین کا سر جاندار بنا۔اس کے بعد وہ ترقی پاکر یکے بعد دیگرے امیر شکار، گوالیار کا صوبیدار پھر بدایوں کا صوبیدار مقرر ہوا۔قطب الدین ایبک کی تین بیٹیاں تھیں جن میں سے دو کی شادی اس نے پہلی کے مرجانے پر نصیر الدین قباچہ سے کی اور تیسری کو التمش سے بیاہ دیا۔(9) اس قریبی رشتہ داری کے باعث ہندوستان کی حکمرانی میں ایک ہی قبیلے کا تسلسل رہا یعنی ترک غلاموں کا۔لیکن یہ رشتہ داری ان کے مرادوں پر رکاوٹ نہ بن سکی۔ایبک کی ناگہانی موت پر امراء اور ملوک نے اس کے بیٹے کو تخت پر بٹھا دیا۔آرام شاہ اور قباچہ نے اُچ اور ملتان پر چڑھائی کردی اور دونوں جگہوں پر قبضہ کرلیا۔جس پر امراء نے التمش کو بدایوں سے طلب کیا کہ وہ امور سلطنت کی باگ ڈور سنبھالے۔آرام کی چھوٹی سی فوج بہ آسانی زیر ہوگئی اور غالباً اسے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور التمش دہلی کے تخت پر بیٹھ گیا۔وہ معیز اور قطبی کے زیادہ تر امیروں کے خون کے دریا میں سے گزر کر تخت پر بیٹھا تھا۔اس زمانے میں ترک غلاموں میں جس معیاری سلوک کا رواج تھا اس کے مطابق اسے ایبک کا نمک حرام نہیں ٹھہرایا جاسکتا کہ اس نے اس کے بیٹے کا کام تمام کیا اور نہ ہی اپنے دیگر حریفوں کو خون ریزی کا الزام دیا جاسکتا ہے۔

دیگر سلطانوں کے نصیب میں بھی ایسی ہی خون آشامی لکھی تھی تاج الدین یلدوز کو سلطان محمود غزنوی نے اس وقت خریدا تھا جب وہ لڑکا تھا۔وقت گزرنے کے ساتھ وہ ترک غلاموں کے دستوں کا سربراہ مقرر کیا گیا۔اس کی صلاحیت اور جرأت نے سلطان کا دل جیت لیا جس نے اسے کرمان کے والی کے عہدہ پر فائز کردیا۔منہاج رقم طراز ہے "وہ (کرمان) کا عظیم حکمران ثابت ہوا۔جو یقین، نرمی، خیراندیشی اور نیک طینت ہونے کے علاوہ نہایت وجیہہ بھی تھا۔"معیز الدین کی موت کے بعد وہ امیروں اور ملکوں کی حمایت سے غزنی کا حکمران بن گیا۔وہ ایک زبردست جنگجو بھی تھا مگر قباچہ بالآخر پورے ملک کا بادشاہ بن بیٹھا۔یلدوز نے جوابی حملہ کرکے قباچہ کے سندھ پر قبضہ کرلیا اور خود کو پنجاب میں بھی مستحکم کرلیا۔لیکن التمش نے ۱۲۱۵ء میں اسے شکست دے دی۔یلدوز قیدی بنا کر بدایوں کے قلعہ میں بھیج دیا گیا اور بعد میں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔قباچہ نے ۱۲۱۷ء میں التمش کے سامنے ہتھیار ڈال دیے اور بالآخر ۱۲۲۷ء میں اپنے انجام کو پہنچا۔

قباچہ، ایبک اور یلدوز دونوں کا داماد تھا۔سلطان معیز الدین کے حکم پر یلدوز کی ایک بیٹی ایبک سے بیاہی گئی اور دوسری قباچہ سے۔(10) یہ ذہن میں رہے کہ مسلم شریعت کے مطابق غلام آقا کی منشا اور اجازت کے بغیر نکاح کے بندھن میں داخل نہیں ہوسکتے تھے۔معیز الدین کی عنایت سے قباچہ کو عوامی اور فوجی امور میں کافی تجربہ حاصل ہوچکا تھا اور وہ ادنی سے اعلیٰ مرتبہ پر پہنچ گیا۔اسے اُچ کا گورنر مقرر کیا گیا۔نہایت مختصر مدت میں اس نے ملتان کو بھی قلمرو میں شامل کرلیا اور اسی کے ساتھ سیستان اور پورے سندھ کو بھی۔لیکن اس کی مرادوں کا یلدوز اور التمش کی خواہشات سے تصادم ہوگیا اور سیاسی اقتدار کے کھیل میں شکست کھا گیا۔اسی طرح التمش کے اخلاف نے بلبن کے ہاتھوں شکست کھائی جو بڑی مرادیں رکھنے والا ایک غلام تھا۔

بلبن البار ی قبیلے کا ایک ترک تھا جس سے التمش کا بھی تعلق تھا۔اس کا باپ ۱۰۰۰۰ کنبوں کا خان تھا۔اپنی جوانی میں اسے منگولوں نے پکڑ لیا تھا اور اسے بغداد لے گئے۔بصرہ کے خواجہ جمال الدین نے اسے منگولوں سے خرید لیا۔اس کی پرورش اپنے بیٹوں کی طرح کی اور دیگر غلاموں کے ساتھ اسے ۱۲۳۲ء میں دارالحکومت دہلی لایا۔ (۱۱) کچھ عرصے بعد وہ التمش کے خادموں میں شامل ہوگیا۔یہ سرکاری وقائع نگار منہاج سراج کی روایت ہے۔تاہم عصامی کے مطابق چند چینی سوداگران نے دیگر اشیا کے ساتھ ۴۰ غلاموں کو سلطان التمش کی خدمت میں پیش کیا۔سلطان نے بلبن کو رد کردیا، وہ پستہ قد تھا۔لیکن وزیر کمال الدین محمد جنیدی نے بلبن میں پوشیدہ ہونہار اوصاف دیکھ کر اسے خرید لیا۔ابن بطوطہ کے کہنا یہ ہے۔سلطان التمش نے سو غلاموں کا یکمشت سودا کیا لیکن اس میں سے بلبن کو نکال دیا۔جب آخر الذکر نے سلطان سے دریافت کیا کہ اس نے اتنے غلام کس لئے خریدے ہیں تو التمش کا جواب تھا "اپنے واسطے" جس پر بلبن گڑگڑایا کہ وہ اسے بھی از راہ خدا خرید لے۔اس کی التجا پر رحم کھا کر التمش نے اسے بھی خرید لیا۔قصہ مختصر بلبن التمش کے خدمت گاروں میں شامل ہو کر خاصہ بردار (ذاتی پیش کار) مقرر ہوا اور اس کے بعد "چالیس غلاموں" کے مشہور دستے میں شامل ہوگیا۔

PDF created with pdfFactory trial version www.pdffactory.com

نے نئے بادشاہ بہرام کی تخت نشینی میں بھی مدد کی جس نے اسے یہ صلہ دیا کہ اسے ریواڑی کی جاگیر عطا کردی بعدازاں اس میں ہانسی کا بھی اضافہ کردیا۔اس کی چالاکی اور عیاری نے ناصرالدین محمود کو تخت حاصل کرنے میں بھی اہم کردار ادا کیا۔وہ بادشاہ کا مشیر خاص بن گیا۔(12) چند سال کے بعد اس نے اپنی حیثیت کو اس طرح مزید مستحکم کرلیا جب اپنی بیٹی سلطان سے بیاہ دی جس پر اسے الغ خان (خان اعظم) کے خطاب سے نوازا گیا اور نائب السلطنت مقرر کیا گیا۔وہ ۱۲۶۵ء میں بادشاہ بننے تک سلطنت میں سب سے زیادہ اثر ورسوخ رکھنے والا امیر تھا۔کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ اسی نے سلطان ناصرالدین کو زہر دلوایا۔

غلام بادشاہ:

مذکورہ غلاموں کی کامیابیوں کے زیر اثر متعدد اہل علم لوگوں نے قرون وسطی کے مسلم نظام غلامی کی بڑی تعریف کی اور اسے لاجواب قرار دیا ہے۔اور اس پر زور دیا کہ اس نظام میں اتنی گنجائش تھی جس میں ایک غلام بھی ترقی کرتا ہوا بادشاہ بن سکتا تھا۔یہ کوئی درست جائزہ نہیں ہے۔غلاموں کو اس لئے نہیں پکڑا جاتا تھا کہ انہیں بادشاہ بنانا مقصود ہوتا۔انہیں اغوا کیا جاتا، پکڑ لیا جاتا یا پھر خریدا جاتا تا کہ وہ بطور خانگی ملازم کام کریں، چوکیداری کریں یا سپاہی بن جائیں۔وغیرہ وغیرہ۔انہیں تحصیل زر کے لئے بیچ ڈالا جاتا''غلام''اور''بادشاہ'' کی اصطلاح ایک دوسرے کی ضد ہیں۔اگر چند غلام بادشاہ بن بھی گئے تو اس کا یہ سبب نہ تھا کہ رائج نظام انہیں یہ مواقع مہیا کرتا تھا بلکہ اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ وہ اپنی صلاحیتوں کی وجہ سے ناروا ریشہ دوانیوں میں پڑ جاتے ،لڑاکا دستوں کو اپنا پیرو بنا لیتے اور مناسب موقعوں پر چوٹ لگا کر تخت پر قبضہ کرلیتے۔عصامی نے غلام سلطان شمس الدین التمش کے منہ سے یہ کہلایا ہے اور اعلان کیا''تم دنیا کو ترک کے اور فخر ومباہات سے نہیں لے سکتے، یہ تمہیں میدان جنگ میں تلوار سونتنے سے مل سکتی ہے۔(14) بادشاہت تو صرف شمشیر سے ملتی ہے۔نہ کہ صرف وفاداری یا خدمت گزاری سے مہم جو غلام کھلم کھلا فرمانروا کی قوتوں کو بے دخل کر کے اپنے اقتدار میں اضافہ کرتے۔حضرت عمرؓ کی شہادت اور ان کا نابینا کیا جانا (۶۶۴ء) علاءالدین خلجی کا (۱۳۱۶ء) میں اپنے بزرگ سے سلوک، مبارک خلجی (۱۳۲۰ء)، فرخ سیر (۱۷۱۹ء) اور شاہ عالم (۱۷۸۸ء) کا ان کے غلام ملکوں کے ہاتھوں ٹھکانے لگائے جانے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حکمران بادشاہ کو قدم قدم پر فریب کا پھندا ملتا۔یوں پورے عہد وسطی میں غلاموں کی بندگی اور سازشوں سے سابقہ رہتا۔ایسے ماحول میں وفاداری ایک ایسی عیاشی تھی جس کے کچھ ہی لوگ متحمل ہوتے۔ایک بات یقینی ہے۔ان''موافق مواقع'' میں جس سے اعلیٰ عہدوں کے لئے راہ کھلتی ہو ان میں کسی اخلاقی ضابطے کا دخل ممکن نہیں۔یہ سب کچھ ہندوستان کے ترک غلام حکمرانوں کے ادوار حکومت میں دیکھا جاسکتا ہے، جنہیں محض اپنی کامیابی کے بل بوتے پر چند جدید مورخین قابل ذکر افراد ٹھہراتے ہیں۔ان تمام واقعات میں یہ مثل صادق آتی ہے''کامیابی سے بڑی کوئی چیز نہیں ہے'' اگر چند غلام ترقی کر کے بادشاہ بن بھی گئے تو کثیر تعداد ایسوں کی ہے جو اتنے ہی مرادیں رکھتے اور ایسے ہی کارگزار مگر گمکردہ راہ ہو گئے۔

ایسا ہی ایک اختیارالدین بختیار خلجی گزرا ہے۔اسے خود کو منوانے میں بہت وقت لگا۔وہ صوبہ گرم سیر کے قبیلے غور سے تعلق رکھتا تھا۔وہ غزنی میں سلطان معیزالدین کے دربار میں پہنچ گیا اور دیوان ارض (فوجی محکمہ) میں بھرتی ہونے کے لئے درخواست گزاری کی لیکن اسے رد کر دیا گیا۔اس وجہ سے وہ غزنی سے ہندوستان کی جانب عازم ہوا مگر وہ دہلی میں بھی دیوان ارض کے لئے رد کر دیا گیا۔اس کے بعد وہ بدایوں چلا گیا اور ازاں بعد اودھ جا پہنچا۔اودھ کے حکمران ملک حسام الدین آغل بیگ (یہ ترکی لفظ ہے جس کے معنی ریوڑ کا آقا) نے اسے دو جاگیریں گزر اوقات کے واسطے دے دیں۔اس نے جلد ہی حصول اقتدار کے جملہ وسائل جیسے اسلحہ جات، نفری اور گھوڑے جمع کر لئے اور علاقہ جات بہار اور منگھیر پر دھاوا بولنا شروع کر دیا۔اس کی بہادری اور حملوں میں لوٹ مار کرنے کی خبریں دور دور تک پھیل گئیں اور پورے ہندوستان سے خلجی جنگجو اس کے پرچم تلے آ کر کشاں کشاں جمع ہونے لگے۔اس کی لوٹ مار کی تفصیلات جب قطب الدین ایبک کے کان میں پڑیں تو اس نے اس کے واسطے ایک خلعت فاخرہ روانہ کی اور اسے سلطان کی طرف سے ۱۲۰۲ء میں بہار فتح کرنے اور یلغار کرنے کے لئے کمانڈر مقرر کر دیا۔(15) اختیارالدین بختیار خلجی نے بہار اور بنگال کو اچھی طرح تاراج کیا لیکن اس کی موت رسوا کن اور بے کسی کی تھی۔

مختصراً جیسا کہ یحیی نے پندرہویں صدی عیسوی میں سمیٹتے ہوئے لکھا ہے''ہر امیر اور ملک سلطان بننا چاہتا تھا''(16) بے شک یہ بھی درست ہے کہ چند ہی کامیاب ہوئے۔غلام امرا جنہیں شہرت ملی، حیثیت ملی یا تاج ان سے لوگ ڈرتے، دوستی کرتے اور چاپلوسی کرتے۔دیگر کو زیادہ توجہ نہ ملتی۔پہلی قسم کے لوگوں کی شان میں منہاج سراج نے جو داد کے ڈونگرے برسائے ہیں وہ قابل بیان ہیں''قطب الدین ایبک بدشکل اور بدوضع تھا لیکن تخت نشین ہوا، بقول ہمارے مصنف کے وہ تمام قابل تعریف اوصاف کا حامل تھا اور بارعب تھا۔۔۔اور مخیر قطب الدیب ایبک یعنی حاتم ثانی اور اعلیٰ ظرف اور فیاض تاجور۔رب ذوالجلال نے اسے تہور اور فیاضی سے معمور کیا تھا، دنیا بھر میں اس کے ہم عصروں میں اس جیسا کوئی نہ تھا چاہے مشرق ہو یا مغرب کہ اس کا ہم پلا ہو(17) نصیرالدین قباچہ''بھی بڑی فراست'' ذکاوت، احتیاط، ہنر عقل و دانش اور تجربے سے مملو تھا۔۔۔(18) جب کہ بہاءالدین طغرل جو تھا نگیر یا بیانہ کا صوبیدار تھا''وہ عمدہ طبیعت کا مالک تھا، معقول حد تک غیر جانبدار، عادل غریبوں اور لاوارثوں پر رحم کرنے والا اور منکسر مزاج۔''(19)۔سلطان التمش''ایک منصف مزاج اور دریا دل سلطان تھا کھرا، فیاض، دھن کا پکا اور کفار کے مقابلے میں ثابت قدم جنگجو، اہل علم کا مربی اور انصاف کرنے والا۔۔۔اور اپنی حکمرانی میں۔۔۔اور مسلم عقائد کا جاں باز اور نیر اعظم۔شجاعت میں وہ ایک اور تند و تیز علی ثابت ہوا، اور فیاضی میں دوسرا حاتم طائی۔(20)۔یہاں تک کہ بڑی تاخیر سے تسلیم کیا جانے والا اختیارالدین بختیار خلجی بے باک، صاحب فراست اور ماہر(21)۔'' لیکن جب وہ تبت کی مہم کی ناکامی کے بعد عمر رسیدگی اور نقاہت سے بستر مرگ پر پڑا ہوا تھا۔اس وقت ہمارے مورخ کے پاس اس کے علاوہ کہنے کو کچھ نہ تھا کہ''علی مردان کسی طرح اس تک پہنچ گیا اس کے چہرے پر سے چادر ہٹائی اور خنجر سے اسے قتل کر دیا۔'' اور اس کے سوا کچھ نہ کہا کہ''یہ واقعات اور بلائیں ۶۰۲ھ میں درپیش آئیں (۱۲۰۵ء۔۱۲۰۶ء)۔(22)

اس زمانے کے مدح خوانوں کے لئے ان غلاموں کی مدح خوانی روایت کے مطابق ہوتی جو تخت پر قبضہ کرلیتے۔ان تمام معاملات میں تلوار کی طولانی اور حامیوں کی قوت کہیں زیادہ اہمیت رکھتی بہ نسبت وراثت کے دعووں یا پھر خلیفہ کے جاری کردہ پروانہ کے۔پہلے چاروں خلفاء کی تو پیغمبرؐ سے براہ راست رشتہ داری تھی۔اس لئے عالم اسلام میں ان کی بہت عزت کی جاتی تھی۔خلافت کی رسمی حمایت سے جو اخلاقی فائدہ ہوتا اس کا کہیں اثر پایا جاتا یا [illegible] قرون وسطی کے مسلم حکمرانوں [illegible] میں ایک روایت نے جڑ

PDF created with pdfFactory trial version www.pdffactory.com

ردی کاغذ کا پرزہ بن جاتی۔ جیسا کہ ایک مرتبہ محمود غزنوی کے بیٹے شہزادہ مسعود نے عین اس وقت کیا تھا جب اس کے حق وراثت کو اس کے بھائی نے یہ جواب دیا ''تحریر کے مقابلے میں تلوار کہیں زیادہ موثر قوت ہوتی ہے۔'' (23) (چاہے خلیفہ کا پروانہ ہو)۔

اس صورتحال میں خط آزادی (غلام کو آزاد کرنے کی سند) کی بھی کوئی وقعت نہ رہتی۔ جب کہ قانون، سیاست اور مسلم سماج میں خط آزادی کو بہت تقدس حاصل ہوتا تھا۔ اس پر بھی زور دیا جاتا کہ ''کسی بھی غلام کو تخت نشین نہ ہونے دیا جائے جب تک اس کے مالک سے خط آزادی نہ مل جائے۔۔۔ کیونکہ آقا سے خط آزادی ملنے کے بعد کوئی فرد غلام نہیں رہتا۔'' (24) اس میں بھی کوئی شک نہیں ہے کہ متعدد غلاموں نے ایسے خط حاصل کرنے کی کوشش کی جس سے ان کی تاجوری کو قانونی جواز بھی فراہم کیا۔ لیکن بہت سے غلام ایسے تھے اور جن کا ستارہ روبہ عروج تھا وہ بادشاہوں کی طرح رہتے تھے۔ اس دوران میں انہیں نہ تو خط آزادی ملا اور نہ انہیں پروانہ آزادی کی کوئی فکر تھی۔ مثال کے طور پر جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے خراسان میں الپتگین ۵۰۰ گاؤں کا مالک تھا اور ۲۰۰۰ غلاموں کا دستہ بھی رکھتا تھا۔ یوں بطور گورنر خراسان اس کا مرتبہ کسی سلطان سے کم نہ تھا حالانکہ اسے خط آزادی نہیں ملا تھا۔ لیکن چونکہ تلوار ہی واحد اور حتمی فیصلہ کن عنصر تھی اس لئے اخلاقی پرزے کی بھی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ معیز الدین کے اکثر غلام امرا نے سلطان کے جانشین محمود سے خط آزادی جاری کرنے کی درخواست کی اور انہیں مل بھی گئے۔ تاج الدین یلدوز اور نصیر الدین قباچہ کی درخواست پر خطوط آزادی دیے دئے گئے۔ (25) لیکن قطب الدین ایبک کو دہلی کے تخت پر بیٹھنے کے کوئی سال بھر بعد خط آزادی ملا تھا۔ (26) یہ نہ پتہ چل سکا کہ بلبن کو پروانہ آزادی کب ملا۔ ایک جگہ عصری وقائع نگار ضیاء الدین برنی بیان کرتا ہے کہ بلبن تو اس زمانے میں بھی شاہی تام جھام سے رہتا تھا جب وہ ابھی خان تھا۔ (27) کہیں اور لکھتا ہے کہ وہ آزاد ہونے کے بعد تخت نشین ہوا۔ (28) اور اس پر مستزاد کی تمام چالیس امیروں (چہل گانی) نے بیک وقت آزادی (بزرگی) حاصل کی تا کہ کوئی کسی سے ادنٰی نہ سمجھا جائے۔

غلام امرا:

ان ترک غلاموں نے مسلم حکمرانوں کے واسطے ہندوستان میں حکمران طبقہ جنم دیا اور اشرافیہ کہلائے۔ ان میں سے چند ایک بادشاہ بنے اور باقی ماندہ زیادہ تر امرا رہے۔ اشرافیہ میں خان، ملک اور امیر شامل تھے۔ ان اشرافیہ کی سرکاری حیثیت ان کے شغل (عہدہ۔ آفس) خطاب، پھر اقطا (منسلک آراضی) یا پھر مراتب (دربار میں جگہ) سے طے ہوتی تھی۔ ہر امیر چاہے اس کی کوئی حیثیت ہو اپنی فوج رکھتا اور چھوٹا دربار لگاتا۔ کبھی کبھار ان میں سے کوئی اتنی طاقت حاصل کر لیتا کہ سلطان بھی اس سے ڈرنے لگتا۔ علاء الدین عطا ملک جووانی اپنی کتاب ''تاریخ جہاں گشا'' میں لکھتا ہے کہ مسلم ممالک کے اکثر حکمراں ''اپنے ہی خرید شدہ غلام سے بات کرنے میں ڈرتے ہیں اگر آخر الذکر کے اصطبل میں دس گھوڑے ہوں۔۔۔ اگر اسے سپاہ کا کمانڈر بنا دیا جائے اور اسے کہیں اختیارات مل جائیں تو وہ بے لگام ہو جاتا۔ اور عموماً یہی ہوتا ہے کہ مذکورہ افسر بغاوت کا علم بلند کر دیتا ہے (بادشاہ کے خلاف) (29)۔ ابتدائی سلطانوں کے دور حکومت میں صورتحال بالکل ٹھیک ٹھیک ایسی ہی تھی۔ جب سلطان معیز الدین قتل کر دیا گیا تو اس کے قلمرو کے مختلف حصوں میں رشتہ داروں اور امیروں میں ترکے کے لئے تلواریں سونت لی گئیں جس میں اس کے وطن مالوف اور ہندوستان دونوں علاقوں کے غلام شامل تھے۔ ''یہ غلام ملک اور امرائے غور کے امیروں اور ملک سے بزور سلطان کی میت کو قیمتی خزانے سمیت چھین لیا اور ہر چیز پر قبضہ کر لیا'' اور بعد میں اس کی لاش کو غزنی روانہ کر دیا (30)۔ اس سے ترک غلاموں کے اثر و رسوخ کا اندازہ ہوتا ہے جنہیں ہندوستان میں تعینات کیا جاتا جن میں، ایبک، التمش، یلدوز، قباچہ اور بلبن شامل ہیں جو سب ہی خریدے ہوئے غلام تھے۔ وہ آپس میں بھی لڑتے اور دیگر غلام امیروں کی مخالفت کا بھی سامنا کرتے۔ یہ امرا حکمرانوں کی خواہشات اور احکام کا مضحکہ اڑاتے جس سے مقصود اپنی طاقت کا اظہار ہوتا۔ وہ گروہ بندی کرتے اور بادشاہ کے مقررہ کردہ وارث تخت کو رد کر دیتے قطب الدین ایبک چاہتا تھا کہ اس کا غلام التمش اس کا جانشین ہو لیکن امرا نے دلی کے تخت پر آرام شاہ کو بٹھا دیا۔ سلطان التمش نے رضیہ کو اپنا جانشین مقرر کیا لیکن ملکوں نے رکن الدین فیروز کو تخت پر بٹھا دیا۔ بلبن نے کیخسرو کو وارث تخت بنانے کا اعلان کیا امرا نے کیقباد کو شاہی تخت سونپ دیا۔ تیرہویں صدی میں لگتا ہے یہ کوئی بری بات نہ تھی جو ہندوستان میں غلاموں کی حکمرانی کا زمانہ ہے۔ دس میں سے انہوں نے چھ کو قتل کر دیا آرام شاہ، رکن الدین فیروز، رضیہ، بہرام، علاء الدین مسعود اور ناصر الدین محمود۔ جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے ان مسلم امرا نے ہندوستان میں مسلم حکمرانی کے علاقوں میں اضافہ کیا اور لوٹ مار سے بڑا خزانہ جمع کیا اور زندگی کے متعدد شعبوں میں تعمیری اور تخریبی حصہ ڈالا۔ لیکن انہوں نے ہمیشہ بادشاہ کے لئے یہ مسئلہ پیدا کئے رکھا کہ انہیں کس طرح مٹھی میں رکھا جائے۔

کوئی بھی بادشاہ تن تنہا بادشاہت نہیں کر سکتا تھا۔ اسے اشراف یا امرا کے ذریعے حکومت چلانا پڑتی۔ جنہیں بطور والی مقتیوں اور اقتدار کے نام سے مقرر کیا جاتا تا کہ متعین فرائض نافذ کریں ڈبلیو۔ ایچ مورلینڈ نے ان تفصیلات کو بیان کیا ہے جنہیں چند غلام امرا نے انجام دیں جیسے طوغان خان، سیف الدین ایبک، طغرل خان اور الغ خان بلبن۔ (31) لیکن ان کی باگیں کھینچ کر رکھنا پڑتیں اور انتظامی کل میں کئی طنابیں ہوتیں جن کے ذریعے سلطان ان پر اپنا تسلط جمائے رکھتا۔ امرا کی زندگی، خطابات اور داد و دہش یہ سب تاجدار کی خوشی اور رحم و کرم پر ہوتا۔ بادشاہ کے عزل و نصب کے بلا شرکت غیرے اختیار امرا کو پوری طرح دست نگر بنا دیتا۔ سلطان ان کا انتخاب کرتے وقت بڑی احتیاط سے کام لیتا اور ان مناصب پر اپنے رشتہ داروں کو یا پھر زر خرید غلاموں کو فائز کرتا۔ بطور مزید احتیاط ایک پٹا ہوا حربہ بھی اختیار کیا جاتا۔ چند مواقع پر نیا بادشاہ سابق تاجور کے تمام امرا کو سبکدوش کر کے اپنے وفادار غلاموں کو اہم عہدوں پر تعینات کر دیتا۔ اس طرح معیزی، قطبی، شمسی اور بلبنی امرا (غلام) یا معیز الدین بن سام کے اشراف جیسے قطب الدین ایبک، شمس الدین التمش اور غیاث الدین بلبن ہوئے۔

ترک اشراف میں ایک خلقی کج تکبر موجود تھا۔ انسانی میلانات سے محروم اور جنگجوی مہارت پر فخر و مباہات ان میں سے ہر ایک یہی محسوس کرتا اور دوسرے سے کہہ بھی دیتا ''تو کیا ہے اور تو کیا کرے گا جو میں نہ کر سکوں گا۔'' (32) ان کے درمیان حسد اور سازشوں کا مناقشہ چلتا رہتا جس سے مسلم مملکت کے استحکام اور تاجور پر تلوار لٹکی رہتی۔ انہیں جامے میں رکھنے کی غرض سے ان میں سے جس پر ارتکاب جرم ثابت ہو جاتا اسے سلطان وحشیانہ اور ذلت آمیز سزا دیتا۔ ملک بق بق جو بدایوں کا صوبیدار ہونے کے علاوہ ۴۰۰۰ سواروں کی جاگیر رکھتا تھا اس نے ایک ملازم پٹوا کر مار ڈالا جس پر سلطان بلبن نے حکم جاری کیا کہ اسے بھرے مجمع میں کوڑے لگائے جائیں۔ بلبن نے اسے

PDF created with pdfFactory trial version www.pdffactory.com

میں کسی شخص کو قتل کروادیا۔ بلبن نے حکم دیا کہ ہیبت کو پانچ سو کوڑے لگائے جائیں اسے یہ بھی حکم دیا کہ وہ مقتول کی بیوہ کو بطور خون بہا ۲۰۰۰۰ تنکہ ادا کرے۔ ہیبت خان کو اس واقعہ سے اتنی شرمندگی ہوئی کہ وہ اپنی موت تک پھر کبھی اپنے گھر سے نہ نکلا۔ امین خان جو اودھ کا صوبہ دار تھا کو ایودیا شہر کے پھاٹک پر اس لئے سولی پر چڑھادیا گیا کیونکہ وہ لڑائی میں بنگال کے باغی طغرل بیگ کو شکست نہ دے سکا۔ کہا جاتا ہے کہ بلبن نے اپنے عم زاد شیر خان کو بھی زہر دے کر ہلاک کروایا جو بھٹنڈہ کو صوبیدار تھا۔ جاسوسی کا ایک نہایت منظّم نظام قائم کیا گیا تھا تاکہ امرا کو دہشت زدہ رکھا جائے۔ جب دہشت زدہ کرنے والے داؤں پیچ سے اشرافیہ اور امرا تلملاتے رہتے تو کم مرتبہ ترکوں کو ترقی دے کر اہم عہدوں پر فائز کر کے انہیں اہم عہدیداروں کے ہم پلہ کر دیا جاتا۔ یہ وہ طریقے تھے جن کے ذریعے غلام حکمراں غلام امیر طبقے کے افراد کو کنٹرول کرتے تھے۔

خلجیوں اور تغلقوں (چودہویں صدی عیسوی) کے عہد حکمرانی میں غلام امرا سلطان کے دائمی خوف میں رہتے تھے۔ ''نہ تو وہ کوئی ایسا کام کرتے اور نہ ہی منہ سے کوئی ایسا لفظ نکالتے جس سے گرفت ہو اور یا پھر سزا پابی۔ (33)۔ افغان اشرافیہ جنہیں کافی مشکل سمجھا جاتا تھا اور اس لئے بہت خود سر تھے وہ کوئی بہتر نہ تھے۔ جب بھی کسی ضلع کے افسر کو سلطان سکندر لودھی (پندرہویں صدی) کا فرمان بھیجا جاتا تو وصول کندہ اسے نہایت ادب واحترام سے وصول کرتا۔ سکندر نے اپنے بلند مرتبہ امرا کو گھٹا کر غلاموں کا درجہ دے دیا تھا تاکہ وہ فخر یہ کہہ سکے ''اگر میں کسی غلام کو حکم دوں کہ وہ پالکی میں بیٹھ جائے تو امرا کی پوری جمیعت کہاروں کی طرح اٹھا کر منزل تک میرے حکم پر پہنچادے گی۔'' (34)۔ بدایونی اسلام شاہ سور (سولہویں صدی) کے زمانے کا ایک آنکھوں دیکھا ماجرا بیان کرتا ہے۔ سن ہجری ۹۵۵ھ تھا (عیسوی ۱۵۱۸) جب وہ لڑکا تھا (وقایع نگار (بدایوانی) دیہی علاقے باجواڑہ گیا۔ جو علاقے بیانہ کے زیئر نگیں تھا۔۔۔ اور وہاں کے رواجوں اور نافذ قوانین کا مطالعہ کیا۔'' اور یہ دیکھا کہ وہ امرا جو ۵۰۰ سے ۲۰۰۰ سوار (ہزاری) تک کے عہدے دار تھے ان کے لئے حکم تھا کہ ہر جمعہ کے دن وہ ایک بلند و بالا خیمہ نصب کرایں اور اس کے بیچوں بیچ میں ایک کرسی رکھی جائے جس پر اسلام شاہ کی جوتیاں رکھی جائیں۔ (اب سلطان کو جوتیاں کہاں سے ملیں؟ آیا وہ فرمان کے ساتھ بھیجی گئی تھیں؟)۔ تمام امیر حسب مراتب اپنے اپنے مقام پر احترام ظاہر کرنے کے لئے سر جھکا کر بیٹھتے۔ جس کے بعد امین فرمان پڑھ کر سناتا جس میں ضوابط اور اصلاحات دی ہوتیں جن پر امرا کو عمل کرنا ہوتا۔ اگر کوئی شاہی احکام کی سرتابی کرتا تو متعلق افسر سلطان کو آگاہ کر دیتا تو نافرمان امیر کو فی الفور سزا دی جاتی جس میں اس کے اہل کنبہ اور رشتہ دار بھی شامل ہوتے۔'' سلطان ہاتھیوں پر قبضہ کر لیتا اور اگر جی چاہتا تو امیر کی پتریاوں (ناچنے والی لڑکیاں) کو بھی تحویل میں لے لیتا۔

مغل عہد میں امرا کو کہیں زیادہ عزت ملتی لیکن فی نفسہ ان کے مرتبہ میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ حقیقت تو یہ تھی کہ جملہ امرا اس بات پر فخر کرتے اور خود کو اپنے سے بلند مرتبہ افراد اور بادشاہ کے غلام کہلاتے۔ بلاشبہ یہ رویہ مسلم آداب اور تہذیب کا ایک حصہ بن گیا۔ اسی سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ شعرا ''اطباء'' موسیقار اور علماء سب ہی غلاموں کے زمرے میں آگئے۔ حق تو یہ ہے کہ وہ تھے بھی۔

شاد ہوں لیکن اپنے جی میں کہ ہوں　　　بادشاہ کا غلام کارگزار غالبؔ (۱۸۵۵ء)

یہ بھی سچ ہے کہ ان میں سے کچھ نہ تو جنگ میں پکڑے گئے تھے اور نہ ہی بردہ منڈی سے خریدے گئے۔ لیکن غلامی کی چند شرائط تھیں جو ان پر بھی ادنی ترین غلاموں کی طرح لاگو ہوتی تھیں۔ وہ ایک دوسرے سے میل ملاقات کے لئے نہیں جاسکتے تھے اور نہ ہی میل جول کی محفل قائم کر سکتے تھے جب تک اس کی اجازت نہ حاصل کر لیں یا کم از کم بادشاہ کے کان میں بات نہ ڈال دی جائے۔ مزید براں انہیں اس کی بھی ممانعت تھی کہ بادشاہ یا آقا کی اجازت کے بغیر مناکحت کا رشتہ قائم کر لیں۔ بادشاہ امیر کا وارث بھی ہوتا اور اس کی موت پر پوری جائداد اولاد کے بجائے بادشاہ کو مل جاتی اور امیر کے بیٹے از خود بادشاہ کے غلام ہو جاتے۔ زیادہ تر بادشاہوں کا دستور تھا کہ وہ اپنے اہم امیروں کی سرگرمیاں کڑی نگرانی میں رکھتے۔ اس لئے امرا اور غلاموں کی حیثیت کے متعلق کسی قسم کی غلط فہمی نہ رہنا چاہیے۔ وہ دونوں ہی غلام ہوتے چاہے بلند مرتبہ ہوں یا ادنیٰ۔ جیسا کہ پیلسیارٹ نے واضح کیا ہے کہ ان کے عہدے فرائض ''دولت، مرتبہ، اعتماد ہر شے ایک تاگے میں بندھی لٹکتی رہتی'' بادشاہ جب چاہتا سب کچھ واپس لے لیتا۔ ''ایک معمولی سے فروگذاشت بھی کسی کو پھانسی گھر یا عقوبت کی کھائی میں پہنچا سکتی تھی۔'' (36)۔ عالی مرتبت امیر کی حیثیت بھی اتنی ہی غیر یقینی تھی جتنی کہ کسی غلام کی۔

PDF created with pdfFactory trial version www.pdffactory.com

باب پانچ

مسلم عہد میں غلام سازی

غلامی اسلامی تاریخ کا لاینفک جزو تھا۔ ترکوں میں ہندوستان کی فتوحات سے پہلے بھی غلامی کا کافی چلن تھا۔ غلام یا تو پکڑ لئے جاتے یا انہیں غارت گر اڑا لے جاتے (سبکتگین بلبن) انہیں حاسد یا ضرورتمند رشتہ داروں نے فروخت کر دیا (التمش) اور انہیں غلاموں کے تاجروں نے منافع حاصل کرنے کی غرض سے فروخت کر دیا (ایبک)۔ ان حربوں سے ہندوستان کے مسلم حکمران واقف تھے۔ یہ سارے داؤں پیچ اور دیگر چالیں ہندوستان میں غلاموں کو حاصل کرنے کے لئے بادشاہوں اور امرا نے چلیں۔ یہ مظاہر اور ان کا استعمال ہندو ذہن کے لئے ایک جھٹکا سا تھا جب کہ مسلمانوں کے خیالات تاہم جدا تھے۔ ابن خلدون کے مطابق اسیران ''کو خانہ جنگ میں سے قوانین غلامی کے تحت خانہ اسلام میں لایا جاتا جس میں حفاظتی نگہداشت من جانب اللہ پنہاں ہوتی۔ غلامی سے شفا پا کر وہ مذہب اسلام میں اس یقین سے داخل ہوتے کہ وہ سچے مومن ہیں۔۔۔'' (ا)۔ مسلمان غلام بنا کر بہت فخر محسوس کرتے۔ جب کہ ہندوؤں کے احساسات ان کے برعکس ہوتے۔

قطب الدین ایبک نے فتوحات کا تانتا باندھ دیا۔ اس نے اختیار الدین بختیار خلجی کو مشرق کی جانب روانہ کیا اور اپنی توجہ پوری طرح خاص ہندوستان پر مرکوز کر دی۔ اس نے کول (جدید علی گڑھ) پر ۱۱۹۴ء میں قبضہ کر لیا۔ وہاں کے ''پڑاؤ میں جو سمجھدار اور تیکھے ناک نقشے والے تھے انہوں نے اسلام قبول کر لیا، لیکن جو اپنے قدیم عقیدے پر قائم رہے انہیں تہ تیغ کر دیا گیا۔'' (2)۔ بات درست ہے کہ لڑائی کے فوراً بعد جنہوں نے اسلام قبول کر لیا وہ ہوشیار اور خوش جمال نکلے۔ کیونکہ ان کی اس پیش قدمی سے انہیں پیدائشی آزاد مسلمان تسلیم کر لیا گیا برخلاف ان کے جو لڑے تھے اور جنگ میں پکڑے گئے یوں غلام بنائے گئے۔ ٹی۔ پی۔ ہیوز اس کا قانونی جواز بیان کرتا ہے۔ ''اگر اسیر بننے والا میدان جنگ میں اسلام قبول کر لے تو وہ مرد آزاد ہوتا: لیکن اگر وہ قیدی بن جاتا اور بعد میں اسلام قبول کرتا تو مذہب کی تبدیلی سے وہ آزاد نہ سمجھا جاتا۔'' عورتیں تو لازماً قیدی بنالی جاتیں۔ ''عطیۃ ال قراظی کا یہ بیان ہے، بنو قریضہ سے جنگ کا پیغمبر نے حکم دیا ان تمام لوگوں کو قتل کر دیا جائے جو جنگ میں لڑنے کے قابل ہوں اور عورتوں اور بچوں کو غلام بنا لیا جائے۔ (3)۔

ہندوستان میں ان دونوں روایات کی پیروی کی جاتی۔ جب ۱۱۹۵ء میں راجہ بھیم پر ایبک نے حملہ کیا تو ۲۰۰۰۰ لوگ پکڑ کر غلام بنالئے گئے۔ اور اسی طرح کالنجر میں ۵۰۰۰۰ بنائے گئے۔ ''مندروں کو مسجدوں میں تبدیل کر دیا گیا۔'' یہ حسن نظامی لکھتا ہے ''اور نماز کے لئے بلانے والوں کی صدائیں نیلگوں آسمان سے باتیں کرنے لگیں۔ اور بت پرستی کا نام نیست نابود کر دیا گیا۔'' (4)۔ بلند آواز میں دن بھر میں پانچ مرتبہ نماز کا بلاوا ایک دعوت اور پیغام کا حامل ہوتا۔ شریک یا پھر۔ لوگ چاہتے تو اس دعوت کو جان پر کھیل کر ٹھکرا سکتے تھے جو روحانی اور جسمانی دونوں ہو سکتی تھیں۔ جیسے جیسے اہل ایمان طاقتور ہوتے گئے جسمانی خطرات بڑھتے گئے۔ (5)۔ اس طریقہ کار نے اسیروں کی تبدیلی مذہب میں بڑی مدد کی۔ مرے ٹائٹس کا یہ تبصرہ برمحل ہے۔ ''ہمیں یہ قبول کرنے میں کوئی شبہ نہ کرنا چاہیے کہ وہ تمام افراد جنہیں غلام بنایا گیا انہیں اپنے آقاؤں کا مذہب اختیار کرنے پر مجبور کیا گیا جن کی ملکیت میں انہیں دیا گیا ہوگا۔'' (6)۔ فرشتہ بطور خاص کہتا ہے کہ کالنجر پر قبضے کے بعد ''پچاس ہزار عورتوں اور مردوں کو طوق غلامی پہنایا گیا۔ مگر انہیں مسلم ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہوا۔'' یوں غلام سازی کے نتیجے میں مذہب کی تبدیلی ہوئی اور اس تبدیلی نے مسلم آبادی میں تیزی سے اضافہ کیا۔

منہاج سراج نے ''دہلی کو پہلی مرتبہ فتح کرنے کے بعد'' قطب الدین نے ہندوستان میں اپنی موت تک ۲۰ قمری سال تک حکمرانی کی دو حیثیت میں پہلے سلطان معیز الدین کے سپہ سالار کی طرح اور بعد میں خود مختار حکمراں بن کر۔ (7)۔ اس عرصے میں ایبک نے ہانسی، میرٹھ، دہلی، رنتھمبور اور کول پر قبضہ کیا۔ (8)۔ جب سلطان معیز الدین نے ہندوستان پر خود آ کر چڑھائی کی تو ایبک اس کے استقبال کرنے کو طویل سفر کر کے پشاور تک گیا۔ اور دونوں نے مل کر کھوکھر کے مستحکم قلعے کوہ جڈ یا سلسلہ ہائے نمک پر حملہ کیا تھا۔ ہندوؤں (کھوکھروں) نے فرار ہو کر اونچے پہاڑوں میں پناہ لی۔ انہیں کھدیڑا گیا۔ وہ سب جو تلوار کی کاٹ سے بچ گئے وہ گھنے جنگلوں میں چھپ گئے دیگر کا یا تو قتل عام ہوا یا پھر اسیر بنالئے گئے۔ بہت بڑی مقدار میں مال غنیمت ہاتھ آیا اور بہت سے غلام ملے۔ (9)۔ بقول فرشتہ تین سے چار لاکھ کھوکھروں کو معیز الدین نے مسلمان بنایا۔ (10)۔ مگر لگتا ہے اس کے اعداد و شمار میں کچھ مبالغہ ہے۔ کوئی سو برس کے بعد امیر خسرو کھوکھروں کو غیر مسلم قبیلہ کہتا ہے اور جس طرح ان پر تواتر سے حملے کئے گئے اور انہیں سلطان التمش اور بلبن نے قتل کرایا خسرو کے دعویٰ کی تصدیق ہو جاتی ہے۔ (11)۔ منہاج یہ بھی کہتا ہے ''کہ کھوکھروں کو کسی بھی صورت (معیز الدین اور ایبک) کے حملے میں ختم نہیں کیا گیا اور انہوں نے بعد کے برسوں میں بہت ادھم مچایا تھا۔'' (12)

ایبک کے عہدہ حکومت میں ہندوستان کا معتد بہ حصہ جو دہلی سے گجرات اور لکھنوتی سے لاہور تک ترکوں کے زیر نگیں آ چکا تھا اسی کے عہد میں وسیع علاقوں پر حملے کئے گئے اور بے حد و حساب لوگ قیدی بنائے گئے جن کے اعداد و شمار دستیاب نہیں ہیں۔ قنوج اور بنارس (جہاں مسلمانوں نے ایک ہزار مندروں پر قبضہ کیا) (13) کی مہموں میں غلام بنائے جانے والوں کے اعداد و شمار اور اسی طرح گجرات، بیانہ اور گوالیار کے بھی دستیاب نہیں ہیں۔ یہی صورت حال بہار اور بنگال کی بھی ہے۔ بارہویں صدی عیسوی کے خاتمے کے قریب یا تیرہویں صدی کے آغاز میں اختیار الدین بختیار خلجی نے بہار پر دھاوا بولا اور نالندہ، وکرم شیلا اور اودن پور کے یونیورسٹی کے مراکز پر حملہ

PDF created with pdfFactory trial version www.pdffactory.com

ہو کر غلام بن گئے۔ لیکن ایسے قیدیوں کے اعداد و شمار کا کوئی علم نہیں ہے۔ ابن اثیر تو صرف یہ لکھتا ہے کہ قطب الدین ایبک نے ''ہند کے صوبوں کے خلاف جنگ کی تھی۔۔۔ اس نے بہت سوں کو قتل کیا قیدیوں اور مال غنیمت کے ساتھ لوٹا''(15)۔ اسی مصنف کے مطابق بنارس میں ''ہندوؤں کو بہت بڑی تعداد میں قتل کیا گیا کسی کو زندہ نہ چھوڑا گیا سوائے عورتوں اور بچوں کے۔(16)۔ جنہیں روایت کے مطابق غلام بنالیا جاتا۔ حبیب اللہ لکھتا ہے کہ مسلمانوں کی دھاک بنارس سے بڑھ کر شاہاباد، پٹنہ، مونگھیر اور بھاگلپور کے اضلاع تک بیٹھ گئی۔(17)۔ اور اس خطہ میں ابتدائی زمانے سے مسلمانوں کی متواتر موجودگی کے حوالوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ لوگوں کو پکڑ کر غلام بنانا اور تبدیلی مذہب مذکورہ علاقے میں ایک عام بات تھی۔ فخر مدبر اس کی اطلاع دیتا ہے کہ معیز الدین اور ایبک کے پرچم تلے ترکوں کی کامرانیوں کے نتیجے میں گیارہ مسلم غریب گھرانے کئی کئی غلاموں کے مالک بن گئے۔(18)

عصری اور بعد کے وقایع نویسوں کی روداد وں سے ہمیں یہ نتیجہ نہ نکال لینا چاہیے کہ ہندوؤں کو پکڑ کر غلام بنالینا بچوں کا کھیل نہ تھا۔ مسلم حملوں اور حکمرانی کے خلاف کڑی مزاحمت ہوتی تھی۔ مزید براں دہلی کے سلطان کو بیک وقت متعدد مسائل سے نبرد آزما ہونا پڑتا تھا۔ سلطان التمش (۱۲۱۰ء۔۱۲۳۶ء) کا زیادہ وقت ترک نژاد امیروں کی سرکوبی میں صرف ہوتا جس میں دلی کے قطبی اور معیز اور پنجاب اور سندھ کے حریفوں یلدوز اور قباچہ تھے۔ اسے منگول فاتح چنگیز خان کے حملے کا بھی خطرہ لاحق تھا اور خوارزمی شہزادے جلال الدین منگبارنی سے بھی جسے چنگیز کھدیڑ رہا تھا۔ اس لئے یہ سولہ برس کے بعد ممکن ہوا کہ اس نے ۱۲۲۶ء میں رانتھمبور پر چڑھائی کی۔ دریں اثنا بہت سی ہندو بادشاہتیں خود مختار ہو چکی تھیں جنہیں ایبک نے زیر کیا تھا۔ جودھ پور کے نزدیک مندر پر ذرا بعد میں حملہ کیا گیا۔ ''بہت سا مال غنیمت'' فاتحین کے ہاتھ آیا یہ بات عیاں ہے کہ ان میں غلام بھی شامل تھے۔(19)۔ عیسوی سال ۱۲۳۱ء نے گوالیار پر دھاوا دیکھا جہاں پر اس نے ''بہت بڑی تعداد میں غلام بنائے'' سال (۱۲۳۴ء۔۱۲۳۵ء) میں اس نے اجین پر حملہ کیا اور مہا کالی کا مندر مسمار کر دیا اور معمول کے مطابق اسیر بنائے ''اور سرکشوں کی عورتوں اور بچوں کو'' قیدی بنالیا۔(20)۔ لیکن اس کے مسلمان ہم وطنوں کی اکثریت سلطان کی کامیابیوں سے دوداریوں میں اس لئے مطمئن نہ تھی کیونکہ وہ مناسب رفتار سے غلام نہیں بنا رہا تھا اور علاقے کو ایک ہی ہلے میں دارالسلام نہ بنا پایا تھا۔

یہ بھی درست ہے کہ غیر ملکی مسلمان جن میں آزاد اور غلام دونوں تھے ہندوستان میں جوق در جوق جمع ہو رہے تھے اور یہ صورتحال سلطنت کے لئے بڑی مفید تھی۔ مہم جو اور ملازمت کے خواہاں ہندوستان میں مجمع کئے ہوئے تھے جو اسلام کے لئے ایک عطیہ خداوندی تھا۔ زیادہ اہمیت یہ تھی کہ مغل آندھی کی وجہ سے کم وبیش پچیس مسلم مہاجر شہزادے اپنے لاؤ لشکر کے ہمراہ خراسان اور ماوراالنہر سے التمش کے دربار میں لشتم پشتم پہنچے۔(21)۔ بلبن کے عہد حکومت میں مزید پندرہ مہاجر حکمران اپنے امرا اور غلاموں کے ساتھ ترکستان، خراسان، عراق، آذربائی جان فارس اور روم (ترکی)، اور شام سے وارد ہوئے۔(22)۔ ان کے پیروکار صاحبان قلم، اہل شمشیر، علماء، مشائخ، مورخین اور شعرا بھی شامل تھے۔ ان گروہوں کا ہندوستان کو اسلام کا جامہ پہنانے کے لئے بہت زیادہ دباؤ ہوگا۔ التمش کو ۱۲۲۸ء میں المستنصر باللہ کی طرف سے سند حکمرانی موصول ہوئی۔ جو بغداد میں خلیفہ تھا۔ جس سے ہندوستان میں مسلم حکمرانی کی عزت اور وقار میں بے حد اضافہ ہوا۔ جہاں یہ سند وجہ ہمت افزائی ہوئی وہیں ایک دباؤ بھی بنی۔ اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں کہ دہلی دارالاسلام لگتا تھا اور حکمران اسلام کی مشرقی دنیا کا سربراہ۔(23)۔ لیکن چونکہ نہ پورا ملک ابھی فتح ہوا تھا اور نہ ہی آبادی مسلمان ہوئی تھی۔ جس کا علماء اور مشائخ کو ملال تھا۔

غلام سازی ایک پالیسی:

چند علماء نے اس لئے ''متقی'' سلطان التمش سے رابطہ کیا اور اسے شریعت کے مطابق حکمرانی کرنے کو کہا اور ہندوؤں سے اس طرح پیش آنے کو کہا کہ ان کے پاس دو ہی راستے ہیں مسلمان ہو جائیں یا پھر موت کو گلے لگالیں۔ مسلمان اپنی حکمرانی قائم کر چکے تھے یوں ملک دارالسلام بن چکا تھا۔ اور اس کی کسی صورت میں مخالفت کار بغاوت ہے۔ یوں ہندو جنہوں نے اس تسلط کی فطرتاً مزاحمت کی ہوگی انہیں باغی سمجھا گیا۔ اس کے علاوہ بت پرست (مشرک) تھے یوں انہیں کفار کا مرتبہ نہیں مل سکتا۔ جو اہل کتاب مسیحی اور یہودی ہوتے ہیں۔ ان کے لئے قانون میں قبول اسلام یا پھر موت درج ہے۔ گذشتہ پانچ صدیوں میں مسلم فقہ وقت کی بھٹی میں سے نکل کر شفاف ہو چکی تھی۔ مسلم فقہ کے چار مکاتب وضع ہونے کے علاوہ شیخ برہاں الدین علی کی ہدایہ (۵۳۰۔۵۹۶ھ مطابق ۱۱۳۵ء۔۱۱۹۹ء) جو سنی قوانین کی جامع کتاب ہے اور جس کا دارومدار قرآن اور حدیث پر ہے وہ بھی التمش کے عہد میں بہ آسانی دستیاب تھی۔ مسلم مقدس صحایف اور مقالے یہ ہدایت دیتے تھے کہ بت پرستوں سے جہاد کیا جائے جن کے لئے قانون کی نظر میں قبول اسلام یا موت تھی۔

اس صورت میں سلطان نے علماء کو یہ جواب دیا ''فی الحال ہندوستان میں۔۔۔ مسلمان اتنی قلیل تعداد میں ہیں ''جیسے کھانے میں نمک''۔۔۔ تاہم چند برس کے بعد دارالحکومت میں قرب وجوار کے علاقوں میں اور چھوٹے شہروں میں مسلمانوں کے قدم جب اچھی طرح جم جائیں گے اور فوجی دستوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہو جائے گا۔۔۔ تب یہ ممکن ہوگا کہ ہم ہندوؤں کو موت یا اسلام قبول کرنے کو کہہ سکیں۔''(24)۔ ایسی معذرت خواہانہ دلیل پیش کرنا ضروری نہ تھا۔ حقیقت تو یہ تھی کہ مسلم عہد اسلام اور موت میں سے کسی ایک کا انتخاب دے رہا تھا۔ وہ لوگ جو میدان جنگ میں مارے گئے وہ مردہ تھے اور ان کا قصہ تمام ہو چکا تھا مگر ان کے دست نگر سب غلام بنائے جا چکے تھے۔ وہ اب ہندو نہ رہے تھے اور انہیں وقت کے ساتھ مسلمان بنایا جا چکا تھا چاہے قیدی بنائے جاتے ہی ایسا نہ کیا گیا ہو۔

یوں غلام سازی پر عملدرآمد میں کسی قسم کا تساہل نہ دیکھنے میں آیا۔ منہاج سراج لکھتا ہے کہ الغ خاں بلبن'' کا اسیر بنانا اور بڑے بڑے رانا ہندوؤں کے زیر کفالت افراد کا قیدی بنائے جانے کا ماجرا بڑے دل گردے کا کام ہے۔'' جب وہ اودھ میں ہونے والی جنگ کے متعلق گفتگو کرتا ہے جو دومان چنڈیلا کے (منہاج کی دلاکی وملاکی) ٹریلوکیا ورمن) کے خلاف لڑی گئی، وقائع نویس کہتا ہے کہ ''تمام کافروں کی بیویاں، بیٹے اور دست نگر ۔۔۔ اور بچے فاتحین کے ہاتھ آ گئے''۔ تھمبور کے خلاف اپنی مہم جو

PDF created with pdfFactory trial version www.pdffactory.com

کامپل، پٹیالی اور بھوج پور کے خلاف مہموں کی رہنمائی کی اور ہر مرتبہ بہت بڑی تعداد میں عورتوں اور بچوں کو غلام بنایا کیٹھر میں اس نے قتل عام کا حکم دیا جس میں تمام نرینہ آبادی کو جن کی عمر آٹھ برس سے اوپر تھی قتل کرادیا اور عورتوں اور بچوں کو اپنے ساتھ لے گیا۔(26)۔۶۵۸ھ (۱۲۶۰ء) میں الغ خان بلبن نے ایک بڑی فوج کے ساتھ رنتھمبور، میوات اور سیوالک کی طرف کوچ کیا۔اس نے یہ اعلان جاری کرایا کہ اگر کوئی سپاہی کوئی زندہ قیدی پکڑ کر لائے گا تو اسے انعام میں دو چاندی والے تنکے ملیں گے اور اگر کوئی صرف کٹا ہوا سر پیش کرے گا تو ایک تنکہ دیا جائے گا۔جلد ہی اس کے سامنے تین سے چار سو زندہ اور مردہ پیش کردیے گئے۔(27)۔بلبن کی طرح التمش کے دیگر کمانداریا ''ہند کے شمسیہ ملک'' ہندوستان کے طول و عرض میں دھاوے بول رہے تھے۔شہروں اور دیہات پر حملہ آور ہوتے اور لوگوں کو غلام بناتے۔یہی صورت حال لکھنوتی سے لاہور تک اور اجمیر سے اجین تک جاری وساری تھی۔ہندو عادت کے مطابق اپنے علاقوں پر دوبارہ قبضہ کرلیتے جب مسلم افواج وہاں سے گزرتی ہوئی آگ اور شمشیر برساتی جاتیں۔اور ترک افواج ان شہروں کو جو ہاتھ سے نکل جاتے ان پر قبضہ کرنے کی غرض سے پھر سے حملہ کردیتیں۔لیکن جو لوگ ایک مرتبہ قیدی بن جاتے وہ غلام بننے کے بعد ہمیشہ کے لئے مسلمان ہو جاتے۔ایسے غلاموں کی صحیح صحیح تعداد کا کہیں بھی ذکر نہیں ملتا اس لئے ان کی کل تعداد کا حساب بھی نہیں لگایا جاسکتا۔جو کچھ علم میں آیا ہے وہ یہ ہے کہ انہیں ریوڑوں کی طرح پکڑا جاتا تھا۔صرف ایک مثال شاید اس لئے کافی ہو جس سے اندازہ ہو سکے کہ ان کی کیا تعداد تھی۔ناصر الدین ابن التمش جیسے کمزور سلطان کے عہد میں قیدیوں کا تانتا ایسا بندھا ہوا تھا کہ ایک مرتبہ اس نے اپنے وقایع نگار منہاج سراج کو غلاموں کی چالیس مالا دیں تاکہ وہ انہیں اس کی ''عزیز، ہمشیرہ'' کو خراسان پہنچادے۔

خلجیوں کے عہد میں غلام سازی:

خلجیوں اور تغلقوں کے عہد میں بہ زمانہ جنگ غلام بنانے کا رواج زور پکڑ لیتا۔التمش کے بعد دو یا تین نسلوں کے اندر ہی مسلمانوں نے ہندوستان کی دھرتی میں اپنی جڑیں گہری کرلیں۔سلطنت کی حدود میں توسیع ہو رہی تھی اور افواج میں اضافہ ہو رہا تھا۔بت پرستوں کو مسلمان بنانے یا انہیں قتل کرنے کی آرزو ہمہ وقت مچلتی رہتی۔بلاشبہ اس سلسلے میں کامیابیوں کا انحصار مسلم حکمران کی شخصیت، وسائل اور عزم پر ہوتا۔مثلاً اگرچہ جلال الدین خلجی ایک معمر اور پس و پیش کرنے والا بادشاہ تھا اس کے باوجود اس نے بھی اس امر پر برہمی کا اظہار کیا کہ وہ ہندوؤں سے قانون کے مطابق نمٹ رہا ہے۔(29)۔اپنے چھ سالہ دور حکومت (جو ۱۲۹۰ء سے جولائی ۱۲۹۶ء تک) میں اس نے متعدد چڑھائیاں کیں اور قیدی بنائے۔ملک چھجو کی شورش فرو کرنے کے بعد جو اسی شکست خوردہ عہد حکومت کا چشم و چراغ تھا جسے وہ شکست دے کر سلطان بنا تھا۔اس نے پیش قدمی جاری رکھی اور فرخ آباد ضلع کے بھوجپور کے ہندوؤں پر بے رحمی سے ٹوٹ پڑا جو کیٹھر (جو بعد میں روہیل کھنڈ کہلایا) کے علاقے میں تھا۔رنتھمبور کی اس مہم میں اس نے مندروں کو مسمار کیا پڑوس میں اجین کو تاراج کیا اور مال غنیمت کے علاوہ بہت سے اسیر بنائے اور ''بہشت کی دوزخ'' تیار کی۔(30)۔اس کے بعد مالوہ پر حملہ کیا گیا اور لوٹ میں بہت کچھ ہاتھ آیا فطرتاً اس میں غلاموں کی بڑی تعداد شامل تھی جنہیں دہلی پہنچایا گیا۔(31)۔اس کی آخری مہم گوالیار پر ہوئی تھی۔

جلال الدین کا بھتیجا اور تخت نشین ہونے والا علاءالدین خلجی (۱۲۹۶ء۔۱۳۱۶ء) نہایت طاقتور بادشاہ ثابت ہوا۔اس نے ۱۲۹۶ء میں دیوناگری پر دھاوا بولا۔اپنے راستے میں پڑنے والے گونڈوانا اور خاندیش میں اس نے لاتعداد مہاجنوں اور کسانوں کو اسیر بنایا اور بڑی رقوم کے عوض رہا کرتا گیا۔(33)۔دیوناگری میں اس نے راجہ کے متعدد رشتہ داروں کو غلام بنالیا اسی طرح مہاجنوں اور برہمنوں کو بھی۔اس نے انہیں شکنجوں اور زنجیروں میں کس کر قلعہ کے سامنے گھمایا تاکہ محصور بادشاہ کو دباؤ میں لیا جائے۔فتح یاب ہونے کے بعد حالات سے مجبور ہو کر اس نے بہت سے اسیروں کو رہا کردیا۔وہ اس وقت محض ایک شہزادہ تھا جس نے سلطان سے اجازت لئے بغیر دکن پر چڑھائی کی تھی۔لیکن اس کا بہت بڑی تعداد میں غلام بنالینا مسلم سلاطین کی پالیسی سے مطابقت رکھتا تھا۔اور آنے والے دور کی ایک دھندلی سی تصویر تھی جو اس کے عہد حکومت میں ہونے والا تھا۔

تخت نشینی کے بعد علاءالدین خلجی نے فتوحات کا تانتا باندھ دیا۔وہ سلطنت عہد کا عظیم ترین بادشاہ ثابت ہوا (۱۲۰۰ء تا ۱۵۰۰ء) اور جہاں تک غلاموں کے پکڑنے کا معاملہ ہے وہ حیرت انگیز نکلا۔اس نے کارروائی کا آغاز اپنے بھائیوں اور ان کے سسرالی رشتہ داروں اور ان کے غلاموں کو پکڑنے سے کیا۔(34)۔اس نے ۱۲۹۹ء میں گجرات پر حملہ کرنے کی غرض سے ایک بڑی فوج روانہ کی۔وہاں کے تمام اہم شہروں اور قصبات کو جیسے نہروالا ''رساول'' وان منتھلی، سورت، کام بے، سومناتھ وغیرہ کو تاراج کیا گیا۔وہاں کے مندروں کو توڑا گیا، دولت لوٹی گئی اور دونوں صنفوں کے بہت بڑی تعداد میں لوگوں کو قیدی بنالیا گیا۔جس میں معروف ملک کافور (35) بھی شامل تھا اور واگھیلا بادشاہ کی شریک حیات کملا دیوی بھی شامل تھی۔وصاف کے بقول مسلم فوج نے سومناتھ کو فتح کرکے ''بہت بڑی تعداد میں حسین اور جمیل دوشیزاوں کو جن کی تعداد ۲۰۰۰۰ بنتی ہے جن میں دونوں صنف کے بچے بھی شامل ہیں۔۔۔مسلم فوج نے پورے ملک کو ملبے کا ڈھیر بنادیا اور باشندوں کی زندگی کو برباد کردیا، شہروں پر قبضہ کرکے باسیوں کو قید کرلیا۔۔(37)۔رنتھمبور پر ۱۳۰۱ء میں حملہ کیا گیا اور ۱۳۰۳ء میں چتوڑ پر۔چتوڑ کی فتح میں ۳۰۰۰۰ نفوس کا سفاکی سے قتل عام کیا گیا اور یہ واضح ہے کہ ان کے کنبوں کے خوردوں کو بھی گرفتار کرلیا گیا۔بہت بڑی تعداد میں مالوہ، سیوانہ اور جالور (۱۳۰۵ء۔۱۳۱۱ء) کی مہموں میں غلام بنائے گئے: جن کا اس مطالعے کے دوران آئندہ پھر حوالہ دیا جائے گا۔راجپوتوں کی بہادری اور سورمائی کو دھیان میں رکھ کر یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ راجستھان میں بڑی تعداد میں لوگ قیدی نہ بنائے جاسکے اس میں ان کی رسوم ستی اور جوہر کرنے کا بھی دخل تھا۔لیکن ملک کافور کی سپہ سالاری میں دکن بھیجی جانے والی نہایت کامیاب مہموں نے قیدیوں کے دستوں پر دستے مہیا کئے ہوں گے۔اس کے علاوہ علاءالدین نے محض ہندو غلاموں کے حصول پر اکتفانہ کیا ہوگا۔منگول سالدی (۱۲۹۹ء) کے حملے میں سلطان کے کمانداروں نے اس کے ۱۷۰۰ افسران کو قید کرلیا تھا جن میں مرد اور عورتیں شامل تھیں اور انہیں بطور غلام دہلی روانہ کردیا۔(39)۔علی بیگ، تارطق اور طارغی (۱۳۰۵ء) کے حملوں کے دوران میں ۸۰۰۰ منگول قیدیوں کے سر قلم کئے گئے جن کی قلعہ سیری کے میناروں پر نمائش کی گئی۔ان دنوں مذکورہ قلعہ زیر تعمیر تھا۔(40)۔منگول حملہ آوروں کو یک اور اقبال مند کے ساتھ آنے والی عورتوں اور بچوں کو

PDF created with pdfFactory trial version www.pdffactory.com

اتنی ہی ہندوؤں کے لئے بھی۔ مسلمان تو اس لئے غلام نہ بنائے گئے کیونکہ وہ تو پہلے سے مسلمان تھے۔

سلطان علاء الدین کے لئے غلاموں کو جمع کرنا تو فتح مندی کی شان تھی۔ اس کے عہد میں سلطنت اتنی طاقتور ہو چکی تھی کہ بقول شمس سراج عفیفؔ اس کے زمانے میں ''کسی میں اتنی ہمت نہ تھی کہ احتجاج کرے۔'' (42)۔ ایسی ہی شہادت علیم اور صوفی امیر خسرو کی ہے۔ نوح سپہر میں وہ لکھتا ہے کہ ''ترکوں کا جب جی چاہے کسی ہندو کو پکڑ لیں اسے خرید لیں یا بیچ ڈالیں۔'' (43)۔ اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ہے کہ اس کے عہد میں غلام سازی کا عمل پورے جوش و خروش سے جاری رہا۔ بطور مثال اس نے ذاتی خدمت کے واسطے ۵۰۰۰۰ غلام لڑکے رکھے تھے۔ (44)۔ اور ۷۰۰۰۰ غلام عمارتوں کی تعمیر میں لگے رہتے۔ (45)۔ ہم پر لازم ہے کہ ہم مسلم وقایع نگاروں کے ممنون رہیں جو انہوں نے معلومات کے دفتر مہیا کر دیے جن کی بنیاد پر ہم بلا خوف تردید عمومی اصول اخذ کر سکتے ہیں۔ مثلاً اس معاملے میں برنی واحد مورخ ہے جو عمارات پر کام کرنے والے غلاموں کی تعداد بھی لکھتا ہے اور اسی طرح عفیف ہے جو سلطان علاء الدین کے ان لڑکوں کے متعلق بتاتا ہے جو اس کے کبوتروں کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ ضیاء الدین برنی کا تفصیلی بیان جس میں وہ عہد علاء الدین خلجی میں دہلی میں قائم بردہ فروشی کی منڈی کی تفصیلات کے علاوہ دیگر مقامات پر بھی ایسے بازاروں کا ذکر کرتا ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے وہاں اسیروں کے دستے تسلسل سے چلے آ رہے ہیں۔

تغلقوں کے عہد میں غلام سازی:

تمام سلطانوں کو غلام سازی میں گہری دلچسپی تھی، لیکن لوگوں کو غلام بنانے کے معاملے میں محمد تغلق بدنام تھا۔ ایسا لگتا ہے جیسے اس نے اس معاملے میں علاء الدین خلجی تک کو طفل مکتب بنا دیا ہو یوں اس کی شہرت دور و نزدیک پھیل گئی تھی۔ شہاب الدین احمد عباس اس کے بارے میں رقم طراز ہے۔ ''سلطان بت پرستوں سے جنگ کرنے کے لئے اپنے جذبہ جہاد کے اظہار کے لئے ہمیشہ بے چین رہتا ہے۔۔۔ روزانہ ہزاروں غلام معمولی قیمت پر فروخت کئے جاتے ہیں قیدیوں کی تعداد اتنی بڑی ہے۔ (47)۔ محمد تغلق مہموں کے دوران میں نہ صرف لوگوں کو غلام بناتا بلکہ اسے غیر ملکی اور ہندوستانی غلاموں کے خریدنے اور انہیں جمع کرنے کا بھی شوق تھا۔ ابن بطوطہ کے بقول اس کے باپ غیاث الدین تغلق اور محمد تغلق کے درمیان چپقلش کی وجہ یہ تھی کہ وہ ابھی شہزادہ تھا لیکن غلاموں کی خریداری پر مسرفانہ رقوم خرچ کرتا تھا۔ (48)۔ بحیثیت سلطان بھی اس نے دور دراز علاقے فتح کئے۔ اس نے اپنی فتوحات کا دائرہ، دوار سمدر، مالابار، کمپل، وارنگل، لکھنوتی، سنارگاؤں، نگرکوٹ اور سنبھل تک بڑھا دیا یہ چند ایک معروف جگہوں کے نام ہیں (49)۔ اس کے زمانے میں سولہ بڑی بغاوتیں ہوئیں جنہیں اس نے بے رحمی سے کچل دیا۔ (50)۔ ان تمام فتوحات اور بغاوتوں میں بڑے چاؤ سے غلام بنائے گئے۔ مثلاً ۱۳۴۲ء میں ہلاجون نے لاہور میں سرکشی کی۔ اس کی کھوکھر سردار کول چند مدد کر رہا تھا۔ انہیں شکست ہوئی۔ ''باغیوں کی تین سو عورتوں کو قیدی بنا لیا گیا اور انہیں گوالیار کے قلعے کی جانب روانہ کر دیا گیا جہاں پر ان کی ابن بطوطہ سے ملاقات ہوئی۔ (51)۔ ان کا ایسا ٹھٹ تھا کہ ابن بطوطہ لکھتا ہے۔ ''ایک موقع پر دہلی میں بت پرست اسیر عورتیں آئیں جن میں سے دس کو وزیر نے مجھے بھیج دیا۔ ایک کو تو میں نے اس شخص کو دے دیا جو انہیں میرے پاس لایا تھا مگر وہ کچھ مطمئن نہ تھا۔ میرے دوست نے تین جوان لڑکیاں لے لیں اور مجھے نہیں معلوم کہ باقی ماندہ کا کیا ہوا۔ (52)۔ التمش، محمد تغلق اور فیروز تغلق نے ہندوستان کے باہر خلفاء کو غلاموں کے تحایف بھیجے تھے۔ محمد تغلق نے چینی شہنشاہ کو دیگر تحفوں کے علاوہ ۱۰۰ ہندو غلام، ۱۰۰ نوجوان باندیاں جو ناچ گانے میں مہارت رکھتی تھیں۔۔۔ اور اس کے علاوہ پندرہ مزید غلام۔ (53)۔

ابن بطوطہ کا چشم دید ماجرا جس میں سلطان دو عیدوں پر امرا کو پکڑی ہوئی کنیزیں دیتا ہے یا پھر ان کی بڑی تعداد میں مسلمانوں سے شادی کراتا ہے اسی بات کی عباسؔ کے بیان سے توثیق ہوتی ہے۔ ابن بطوطہ رقم طراز ہے کہ محمد بن تغلق کے دربار میں جب عیدین کے تہوار منائے جاتے تو ہندو راجاؤں کی بیٹیاں اور عامیوں کو جو سال بھر میں پکڑے گئے ہوتے ان سب کو امیروں، افسران اور اہم غیر ملکی غلاموں میں تقسیم کیا جاتا۔ ''چوتھے دن مرد غلاموں کی شادی کی جاتی اور پانچویں روز غلام لڑکیوں کی شادی ہوتی۔ چھٹے دن عورت اور مرد غلاموں کی شادی کی جاتی۔'' (54)۔ یہ ساری کاروائی مسلم قانون کے تحت انجام پاتی۔ جس کے مطابق غلام اپنی مرضی سے شادی نہ کر سکتے جب تک ان کے مالکان سے اجازت نہ لی گئی ہو۔ (55)۔ کسی بت پرست جوڑے کی شادی ایک ساتھ اسلام قبول کر لینے سے فسخ نہ ہوتی۔ (56)۔ رائج حالات میں غلاموں کا پہلے ہی مذہب تبدیل کرا لیا جاتا جس کی تحریک اور اجازت سلطان خود دیتا یوں وہ موثر ہو جاتی۔ ہزاروں غیر مسلم عورتوں (57) کو فیروز تغلق کی سالانہ مہموں کے دوران میں پکڑا جاتا اور اسی کی سرپرستی میں ویسی ہی تقریبات کا اہتمام کیا جاتا جیسے پیشرو کے زمانے میں ہوتا تھا۔ (58)۔ مختصراً تغلقوں کے عہد میں اس پر عورتوں کا تانتا رکنے کا نام نہ لیتا تھا۔

یہی حال مرد غلاموں کا تھا، بالخصوص نو عمر اور کم سنوں کا فیروز تغلق انہیں حاصل کرنے کے لئے ہر قسم کے ذرائع اور ہتھکنڈے استعمال کرتا یوں اس نے ۱۸۰۰۰۰ غلام جمع کر لیے۔ (59)۔ شمس سراج عفیف جو عصری مورخ تھا لکھتا ہے کہ فیروز کے عہد میں ''غلاموں کی بہتاب ہوگئی'' اور مستزاد یہ کہ ''اس ادارے نے مملکت کے ہر مرکز میں جڑیں پکڑ لیں۔'' یہاں تک ہوا کہ جب سلطنت بکھر کر متعدد بادشاہوں میں بٹ گئی پھر بھی غلاموں کا شکار ہر (مسلم) خطے میں جاری رہا۔ (60)۔

غلام بن جانے والوں کے مصائب:

یہ روایت ان کی ہے جو غلام پکڑنے والے اور فاتح تھے۔ پکڑ لئے جانے والوں کی ذلت اور خواری سے مسلم وقایع یکسر خالی ہیں۔ غم و اندوہ کے جاری رہنے درد اور عزت نفس کے علاوہ افتخار ذات کے زیاں سے وہ بوجھ کھینچنے والے بے زبان جانور بن جاتے۔ اسیروں کی جمعیت کو کچلنے کا رواج اور طریقہ جو ایبک، التمش اور بلبن کے دور

PDF created with pdfFactory trial version www.pdffactory.com

تو بندھے ہوئے یا شکنجوں میں کسے یا پابہ زنجیر تھے۔مہم کے آغاز ہی میں اس نے منادی کرادی تھی کہ ہر شاہی سپاہی کو زندہ قیدی پکڑ کر لانے پر بطور صلہ دو نقرئی تنکے دیے جائیں گے اور اگر کوئی کٹا سر لائے گا تو اسے ایک نقری تنکہ ملے گا۔ وہ اس کی خدمت میں روزانہ ۳۰۰۔۴۰۰ زندہ یا مردہ افراد پیش کرتے۔حکمران سلطان نصیرالدین نے متعدد مشاہیر کے قتل کرنے کے احکام جاری کئے۔ دیگر افراد جوان کے مصاحب تھے اندر سے ہل گئے اور بکری بن گئے۔ان کے مصائب کو آپ ہندوستانی تصنیف کے ایک نمونہ وکن ہدادے پرابندہ میںؑ دیکھ سکتے ہیں۔ جو پرانی راجستھانی یا قدیم گجراتی میں لکھی گئی تھی۔ یہ پندرہویں صدی کے وسط میں مرتب کی گئی اور جو جالور کے بادشاہ کنز دیوا کے کارناموں کا ذکر ہے جو اس نے علاء الدین کے جنرل الغ خان کے خلاف انجام دیئے جس نے ۱۲۹۹ء میں گجرات پر حملہ کیا تھا اور لاتعداد افراد کو قیدی بنالیا۔ سوراتھ (سوراشترہ) کے علاقہ میں ''انہوں نے لوگوں کو اسیر بنایا۔ برہمنوں اور بچوں اور عورتوں کو بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ہر وضع کے لوگوں کو۔ ریوڑ کی شکل میں انہیں ایسی پٹیوں سے باندھا گیا جو خام چمڑے سے بنی تھیں۔انہوں نے اتنے لوگوں کو قیدی بنایا جنہیں گنا نہ جاسکتا۔قید خانے (بندی خانے) پر پہرے کی ذمہ داری ترکوں کو سونپی گئی۔'' قیدی سخت تکلیف میں تھے اور بلند آواز میں آہ وزاری کرتے تھے۔'' دن میں وہ جھلسانے والی گرمی جھیلتے، ان پر نہ کوئی سایہ تھا نہ ہی کوئی پناہ گاہ چونکہ وہ (راجستھان کے ریتیلے صحرا) میں تھے۔اسی طرح راتوں میں کھلے آسمان تلے سردی میں ٹھٹھرا کرتے۔ دودھ پیتے بچوں کو ماوؤں کی گود سے اور گھروں سے چھین لیا گیا وہ بھی رو پیٹ رہے تھے۔ ہر قیدی دوسرے اسیر سے بڑھ کر مصیبت کا مارا لگتا تھا۔ وہ پہلے ہی پیاس سے تڑپ رہے تھے اور بھوک سے نڈھال تھے۔۔۔ جس سے ان کی حالت مزید بگڑی ہوئی تھی۔ان میں چند اسیر تو بیمار بھی تھے اور کچھ ایسے بھی تھے جو بیٹھ نہ پاتے۔ان میں سے کچھ ننگے پاؤں تھے اور نہ تن پر کپڑا تھا۔۔۔ کچھ کے پاؤں میں بیڑیاں پڑی تھیں۔ وہ ایک دوسرے سے علیحدہ ہونے کے باوجود چمڑے کی پٹی سے بندھے ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے میں گڈ مڈ تھے۔ بچے اپنے والدین سے بچھڑ چکے تھے جو اس سنگدلی کے نتیجے میں ہوا تھا۔ جوان اور بوڑھے سب ہی غم واندوہ میں دل گرفتہ تھے جب کہ کیمپ کے اس کنارے سے بلند آواز میں رونے کی آوازیں اونچی ہو رہی تھیں جہاں سارے اسیروں کا جمگھٹا لگا ہوا تھا۔۔۔ روئے جاتے آہ وبکا کئے جاتے، انہیں اب بھی اس کی امید تھی کہ کوئی معجزہ ہوگا اور ان کی جان بچ جائے گی۔'' (61)۔ معجزہ ہو کر رہا اور کنہار دیوا نے ایک خون ریز جنگ کے بعد انہیں کامیابی سے چھڑا لیا۔

لیکن اس ماجرے سے ایسی منظر کشی ہوئی ہے جس میں بہادر اور تنومند، خواص اور عامی جو سب ہی قیدی بنا لئے گئے تھے اور جن کی عزت نفس کچل دی گئی تھی۔ یہی وہ روایت تھی جس کے تحت تیمور نے دہلی کو فتح کر لینے کے بعد کوئی ۱۰۰۰۰۰ (ایک لاکھ) قیدیوں کا قتل عام کرایا تھا۔ پہلے تو انہیں اپنے افسروں میں تقسیم کرایا گیا اور انہیں باندھ کر شکنجوں میں رکھا جاتا۔ اسی لئے لشکر تیمور کے ایک عالم مولانا نصیرالدین عمر نے ''اپنی تلوار سے پندرہ بت پرست ہندوؤں کی گردنیں تن سے جدا کی تھیں'' اگر وہ تمام اسیر ''اپنی بندشوں کو توڑ'' سکتے تو ایسی خونریزی ممکن نہ ہوتی۔ بسا اوقات قیدیوں کو اس طرح تیمور کے سامنے پیش کیا جاتا کہ ان کے ہاتھ ان کی گدی سے بندھے ہوتے۔ (62)۔ جہانگیر (۱۶۰۵ء۔۱۶۲۷ء) بھی یہ لکھتا ہے کہ ''اسیروں کو میرے سامنے جوئے میں جوڑ کر پیش کیا جاتا تھا۔(63)۔ان میں سے زیادہ تر کو اس وقت بھی جوئے میں باندھ کر رکھا جاتا جب انہیں بیچنے کی غرض سے دساور بھیجا جاتا یا پھر ہندوستان کی دور دراز کی منڈیوں میں۔ ادھر قیدیوں کا یہ وطیرہ تھا کہ وہ ایک دوسرے سے چپکے رہتے اور ایک دوسرے سے اس وقت بھی جدا نہ ہونا چاہتے جب ان کی جان پر بنی ہو۔ اور مسلم قانون کے تحت انہیں اس کی اجازت بھی نہ تھی جب کہ فاتحین اپنے مخصوص مسلم جذبے کے مطابق ان پر عملدر آمد کراتے تھے۔ ہدایہ میں وضاحت سے درج ہے کہ ''اگر مسلمین کسی بت پرست کی سرزمین پر قابض ہوں تو سب سے پہلے ان پر جزیہ نافذ کیا جائے کیونکہ وہاں کے باشندے اور ان کی بیویاں اور بچے مال غنیمت کا حصہ ہوتے ہیں اور مملکت کی ملکیت۔ چونکہ تمام بت پرستوں کو غلامی کا طوق پہنانا عین شریعت ہے خواہ وہ اہل کتاب ہوں، مجوسی یا پھر بت پرست۔'' (64)۔ ہدایہ میں یہ بھی درج ہے کہ ''جو بھی بت پرست کو قتل کرے گا اسی کو مقتول کی ذاتی جائداد ملے گی۔'' (65)۔ جس میں بیویوں اور بچوں کا شامل ہونا ناگزیز تھا۔ یوں لوگوں کو ایک بڑی تعداد متاثر ہوتی، چاہے اسیر بنانے کا معاملہ ہو، اسلام کے قبول کرنے کا یا پھر قتل عام کرنے کا۔ اگر مقتول بت پرست کے کنبے اس کی عورتوں یا بچوں کا معاملہ ہو یا پھر غول درغول پکڑے جانے والے غلاموں کا جو کسی علاقے سے پکڑے گئے ہوں یا ایسے خطے سے جس کے متعلق معلومات فخر مدبر نے مہیا کی ہیں دونوں کا اطلاق محمد غوری اور قطب الدین ایبک کی مہمات پر ہوتا ہے۔ وہ ہمیں آگاہ کرتا ہے کہ ان کی مہموں کے دوران میں ہر صنف کے غلاموں کو جوق در جوق (گروہوں) پکڑا جاتا جس سے یہ نوبت آ گئی کہ ایسا مفلس صاحب خانہ (یا پھر سپاہی) جس کے پاس ایک غلام بھی نہ تھا کئی غلاموں کے مالک ہو گئے۔(66)۔

مختصراً اسیران کا جینا مرنا ایک ساتھ ہوتا اسی لئے اگر وہ پکڑے جاتے تو بھی وہ بڑی تعداد میں ہوتے۔ اس مظہر کی ایک روشن مثال دکن (۱۳۲۷ء) میں دیکھنے میں آئی جب محمد بن تغلق وہاں ایک شورش کچلنے کی مہم میں مصروف تھا۔ کامپل (جو بیلدری ضلع میں دریائے تنگ بھادرہ کے کنارے پر واقع تھا) کے راجہ کے گیارہ کے گیارہ بیٹے ایک ساتھ پکڑ لئے گئے اور مسلمان بنا لئے گئے۔(67)۔ عموماً تندرست مردوں اور سپاہیوں کو قتل کر دیا جاتا تھا اور ان کے بے یار و مددگار بچوں اور عورتوں کی بڑی تعداد میں یا گروہوں کی صورت میں قید کر لیا جاتا۔(68)۔ زمانہ امن میں بھی ایک یا کئی گاؤں یا گروہوں کے لوگ مل جل کر عمل کرتے۔ جب فیروز شاہ تغلق نے یہ اعلان کرایا کہ ''جو لوگ اسلام قبول کر لیں گے انہیں جزیہ سے استثنٰی حاصل ہو جائے گا۔'' ہندوؤں کی ایک بڑی تعداد نے خود کو پیش کر دیا۔۔۔ اور وہ چہار جانب سے روزانہ آنے لگے۔۔۔ (69)۔ اسی طرح ہندوستان میں داخل ہونے کے وقت سے لے کر دہلی کے مضافات تک پہنچنے تک امیر تیمور کے قبضے میں ۱۰۰۰۰۰ بت پرست اور ہندو قیدی آ چکے تھے۔۔۔ (70)۔ تیمور نے ان سب کو ذبح کرادیا لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اتنی ناقابل یقین تعداد میں لوگ محض اس لئے غلام بن جاتے اس کی وجہ یہ تھی کیونکہ وہ جینے مرنے میں ساتھ رہنا چاہتے تھے چاہے حالات کتنے ہی دگرگوں ہوں۔ اس حقیقت سے ابن بطوطہ کے سوا کون واقف ہو سکتا تھا جس نے ہندوستان کے طول وعرض کی سیر کی تھی۔ اس نے دیہات میں عارضی شبینہ قیام کے دوران میں گاؤں کے گاؤں اجڑے پائے تھے۔(71)۔ قدرتی آفات یا انسانی ستم رانیوں نے باسیوں کو فرار ہونے پر مجبور کر دیا تھا یا اغلب یہ ہے کہ انہیں غلام بنا لیا گیا ہو یا پھر مذہب تبدیل کر چکے ہوں یا پھر دھر لئے گئے ہوں۔ لیکن یہ حقیقت کہ بستیوں کی ویرانی سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ بڑے

PDF created with pdfFactory trial version www.pdffactory.com

فیروز شاہ تغلق کے خصوصی غلام:

فیروز شاہ تغلق کا عہد آنے تک غلامی کے ادارے نے مسلم حاکمیت کے تمام خطوں میں جڑیں پکڑ لی تھیں۔ دہلی کی سلطنت اب دوسو سال کی ہو چکی تھی اور اپنے قدم اچھی طرح جما چکی تھی۔ ہر قسم کے چھوٹے بڑے کاموں کو انجام دینے کے لئے ہمہ اقسام کے غلاموں کی طلب بہت زیادہ تھی۔ اس لئے غلاموں کی ہمہ وقت ضرورت سینکڑوں میں ہوتی اس لئے غلام سازی صرف جنگوں میں بنائے جانے والے قیدیوں تک محدود نہ رہی تھی۔ فیروز تغلق نے غلاموں کے حصول کے واسطے کچھ اور ترکیبیں نکالیں۔ ان میں سے ایک تو معروف ترکیب جو سلطنت عثمانیہ ترکی میں رائج تھی یعنی دیوشرایم سے ملتی جلتی اور اس پر بہت عملدار رہوتا۔

دیوشرایم (یونانی میں معنی، لڑکے جمع کرنا) کا رواج ''یہ معنی رکھتا ہے کہ جبراً مسیحی لڑکوں کو گھیرنا تا کہ نئی فوج ینی چری دستے قائم کئے جائیں۔۔۔ جو ہوں تو ترک سلطنت کے۔۔۔ جن کی تعیناتی یورپی علاقوں میں ہوتی جہاں کی آبادی (اہل یونان، مقدونیہ، البانیہ، سربیا، بوزنیا اور ہرزیگووینا اور بلغاریہ پر) مشتمل ہوتی۔(74)۔ یہی مسیحی، یہودی اور خانہ بدوش تبدیلی مذہب سے مسلمان ہو جاتے اور عسکری تربیت حاصل کرتے تا کہ اپنے ہی سابق بھائی بندوں سے لڑیں۔'' اس ادارے کو ۱۳۳۰ء میں ارخان نے قائم کیا تھا اور اس ادارہ پر کئی صدیوں تک ترک سلاطین کے آمرانہ اقتدار کا انحصار رہا۔ اور ہر چار سال (یا اتنی ہی مدت کے) بعد ایک مستقل کمک کے ذریعے اسے اس طرح توانا رکھا جاتا کہ سلطان کے افسران اضلاع کا دورہ کرتے اور ان بچوں میں سے کچھ کو منتخب کر لیا کرتے جن کی عمریں سات سال کے لگ بھگ ہوتیں۔ قانون کے مسلم شارحین نے اس غیر انسانی عامل کی یہ کہہ کر معذرت چاہی ہے کہ مذکورہ بچے مال غنیمت میں بہ مقدار خمس ہوتے تھے جنہیں قرآن نے حکمران کے واسطے مختص کیا تھا۔

سلطان فیروز نے اپنے بڑے بڑے جاگیرداروں اور افسروں کو حکم دے رکھا تھا کہ جب بھی وہ جنگ کریں غلاموں کو پکڑیں اور ان میں سے چن کر بہترین کو دربار کی خدمت کرنے کے لئے روانہ کریں۔ ہاتھ آنے والے غلاموں کا پانچواں حصہ جو ہندوستان کی جنگوں میں ملتا اسے حکمران (یا خلیفہ) کی جانب روانہ کر دیا جاتا اور یہ سلسلہ محمد بن قاسم کے زمانے سے جاری تھا۔ فیروز تغلق یہ چاہتا تھا کہ غلاموں کو دیوشرایم کی طرح جمع کیا جائے۔ یوں بہت بڑی تعداد میں جمع کئے گئے اور جب ان کی تعداد ضرورت سے بڑھ گئی تو سلطان نے انہیں ملتان، دیپالپور، حصار فیروزہ، سمانا، گجرات اور وفاق کے دیگر باجگذاروں کو بھیج دیا۔

دہلی سلطنت کی یہ پالیسی کہ کاشتکار طبقے کے پاس اسباب زیست کم سے کم رہے اس سے دیوشرایم کے سلسلے میں فیروز کو بہت مدد ملی۔ مسلم حکمرانی میں زرعی پیداوار کا معتدبہ حصہ حکومت بطور ٹیکس لے لیتی تھی جس سے ان کے پاس اتنا تھوڑا سا بچتا جس سے بہ مشکل جسم اور روح کا رشتہ برقرار رہتا یوں وہ قلاش رہتے کیونکہ یہ سمجھا جاتا تھا کہ '' دولت'' ''بغاوت اور عدم اطاعت'' کا باعث ہوتی ہے۔(75)۔ قرون وسطی میں یہ مصلحت جاری وساری تھی۔ جن میں سلاطین اور مغل عہد دونوں شامل ہیں۔ شاہجہان کا عہد آتے آتے حالات ناقابل برداشت ہو گئے جیسا کہ مانکسی اور مانرک نے تصدیق کی ہے۔ کاشتکاروں کو مجبور کیا جاتا کہ وہ اپنی عورتوں اور بچوں کو مالگذاری ادا کرنے کے لئے فروخت کر دیتے۔ مانرک تو یہ بھی لکھتا ہے کہ کسانوں کو اٹھوا کر۔۔۔ مختلف منڈیوں اور میلوں (بیچنے کی غرض سے) پہنچا دیا جاتا، اور ان کی غم زدہ بیویاں ان کے چھوٹے چھوٹے بچوں کو لئے چلاتیں اور آہ وزاری کرتی رہتیں اور واجبات ادا کرتی رہتیں۔'' فرانسسی سیاح بغ نی آغ بھی اس کی توثیق کرتا ہے۔'' کہ بدنصیب کسان جو لٹیرے آقاؤں کے تقاضوں کو پورا کرنے سے قاصر رہتے انہیں ان کے بچوں سے محروم کر دیا جاتا اور انہیں لے بھاگنے کے بعد غلام بنا لیا جاتا۔(76)۔ جیسا کہ عثمانی سلطنت میں ہوتا کہ مسیحی اور یہودی جنہیں مسلمان بنا لیا جاتا انہیں تربیت دی جاتی تا کہ اپنے سابق بھائی بندوں سے لڑیں۔ یوں اسی طرح قرون وسطی میں ایسے ہندوؤں کو جنہیں پکڑ کر مسلمان بنا لیا جاتا انہیں اپنے سابقہ برداری سے ان جنگوں میں لڑنے کو کہا جاتا جو مسلم حکمران قبضہ کرنے کے لئے لڑا کرتے۔ تربیت یافتہ اور اپنے ہی لوگوں سے لڑنے والے یہ مسلمان آج کے ہندوستان اور مشرقی یورپ میں کئی قسم کے مسائل پیدا کر رہے ہیں۔

PDF created with pdfFactory trial version www.pdffactory.com

غلام سازی اور تبدیلی مذہب

مسلمانوں نے جہاں بھی فتوحات کیں۔ مغربی ایشیا میں، مشرقی یورپ میں افریقہ میں یا ہندوستان میں، وہاں انہوں نے یا تو لوگ غلام بنائے یا پھر مسلمان کر ڈالا۔ اس معاملے میں انہیں سب سے زیادہ افریقہ میں کامیابیاں ہوئیں اور سب سے کم ہندوستان میں۔

اسلام کے آغاز کے وقت عرب ابی سینا کے قلمرو میں شامل تھا۔ جب پورا عرب مسلمان ہو چکا تو صورتحال الٹ گئی ابی سینیا کے لوگ عربوں کے ماتحت ہو گئے اور انہوں نے اہل ابی سینیا اور ایتھوپیا کو بلا کسی بڑی مزاحمت کے غلام بنالیا۔ مسلمان افریقہ میں اپنی غلام سازی کی کامیابی پر کافی مطمئن تھے۔ بہت سے مغربی عاملوں نے بھی اس امر کو افسانوی رنگ دیا اور مسلم دنیا میں سیاہ فام غلامی کی مدافعت کی ہے برنارڈ لیوس متعدد یورپی مورخین کا حوالہ دیتا ہے اور کہتا ہے 'نوع انسان کے لئے غلامی رحمت ایزدی ہے جو بے دینوں اور بربروں کو اسلام اور تہذیب کے دائرے میں لاتی ہے۔۔۔ مشرق میں تو غلامی نے نوع انسان کے ہزاروں ارکان کو ارفع حیثیت دی ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو لاکھوں روحیں جنگلی وحوش کی مانند اس دنیا میں ماری ماری پھرتیں مگر جانوروں سے ذرا سا بہتر۔ اس نے کم از کم انہیں انسان بنایا اور کارآمد آدمی بھی'' (١)۔ ٹی۔ ڈبلیو آرنلڈ یہ بھی لکھتا ہے کہ ''مخلص اذہان میں یہ بات دیکھ کر تسلیم کی جا چکی ہے کہ خدا کی ہدایت اور سچا عقیدہ غلامی میں بھی موجود تھا، جیسا کہ بالائی نیل کے حبشی ممالک میں دیکھا گیا ہے۔۔۔ ان اہل افریقہ میں اس بات پر کسی قسم کی برہمی نظر نہیں آتی کہ انہیں غلام بنالیا گیا تھا۔۔۔ حالانکہ سنگدل چور انہیں ان کے والدین سے کرائے پر اچک لیتے تھے۔۔۔ آزادی بہت سی مثالوں میں تبدیلی مذہب کا صلہ ہے۔۔۔ جن مربیوں نے ان کی قیمت ادا کی انہوں نے انہیں اشیائے خانہ داری بنالیا، نروں کا ختنہ کر دیا جاتا اور۔۔۔ اور خدا اس بدنصیبی میں ان کے ساتھ رہتا یوں وہ کہہ سکتے ہیں۔ ''یہ اس کی رحمت تھی'' چونکہ وہ اس طرح محفوظ مذہب میں داخل ہو جاتے۔ (2)۔ لیوس تاہم تسلیم کرتا ہے کہ ''عرب غلامی میں برائیاں ہیں'' اور یہ بھی کہ آزاد شدہ حبشی ''شاذونادر ہی ارزل حیثیت سے ابھر پاتے ہیں۔'' (3)۔ غلامی ذلت آمیز حالت ہوتی ہے اور بہت سے لوگ لازماً اپنی عزت نفس اس وقت گنوا دیتے ہیں جب انہیں اس حالت میں مدت مدید تک رکھا جائے۔ اسے بلاخوف تردید مانا جاتا ہے کہ غلاموں کی تجارت جب مغربی افراد میں آئی تو اس وقت عرب مسلمانوں کی حیثیت اکثر ثالثوں جیسی ہو گئی تھی جس سے افریقی ممالک پر تباہ کن نتائج مرتب ہوئے ہمارے پاس کوئی معقول وجہ نہیں ہے کہ یہ قیاس کر لیں کہ ابتدائی دور والی افریقہ کی مسلم غلامی نے افریقیوں پر کہیں زیادہ کریمانہ اثر چھوڑا ہے۔

مسلمان کالے غلاموں کے ساتھ سفید فام غلام بھی رکھتے جب کہ مغربی ایشیا کم و بیش پورا مسلمان ہو چکا تھا۔ غلامی ایک ایسی کیفیت تھی جس سے کوئی مستثنیٰ نہ تھا چاہے وہ یونانی ہو ترک نژاد ہو یا پھر سکینڈے نیویا ئی ہو جن میں علما اور شعراتک شامل تھے۔ ماضی میں چودھویں اور پندرھوں صدی عیسوی میں بھی سفید فام غلاموں کی کھیپیں جن میں کچھ مسیحی بھی شامل ہوتے وہ شمالی بحیرہ اسود سے ساحلوں پر قائم بردہ منڈیوں تک پہنچتیں۔ جہاں ان دونوں گرم بازاری تھی اور وہاں سے اطالیہ، اسپین، مصر اور بحیرہ روم کے جزائر تک ان کی ریل پیل رہتی۔۔۔ لیکن چونکہ ''افریقہ کا نام غلامی کے ہم نام ہو چکا تھا اس لئے دنیا اس حقیقت کو فراموش کر بیٹھی کہ تاتاری اور بحر اسود کے اطراف کے دیگر لوگ کس بے تابی سے لاکھوں اہل یوکرین، جارجیا، شمالی کوہ قاف، آرمینیا، بلغاریہ، سلافی اور ترکوں کو فروخت کیا کرتے تھے۔ (4)۔

غلامی کے خلاف ہندو مزاحمت:

البتہ ہندوستان میں مسلمانوں کے ہاتھوں ہونے والی غلامی کی مزاحمت ہندوؤں میں مستقل اور بارہ ماسی رہی۔ ہم نے غلامی کے خلاف ہندو مزاحمت اور اس سے وابستہ بربریت کا جو مسلم حکمرانوں نے ڈھائے ہیں ان کا بالتفصیل مطالعہ کسی اور تصنیف میں کیا ہے۔ (5) یہاں پر محض چند حقائق اس غرض سے بیان کئے جا رہے ہیں کہ اس ماجرے میں کوئی کسر نہ رہ جائے۔

کسان تو غلامی کا خطرہ منڈلانے پر گھبرا جاتے کیونکہ حکومتوں کا رویہ نا قابل برداشت ہوتا، ان میں سے چند ایک تو فرار ہو کر جنگلوں میں پناہ لے لیتے۔ مغلوب ہونے والے راجاؤں اور مارے ستائے زمیندار بھی بنوں میں پناہ لے لیتے اور وہیں سے مزاحمت کو منظم کرتے۔ ان تصادم میں زمیندار سرداروں کا کردار ادا کرتے اور کسان ان کے پرچم تلے جمع ہو جاتے۔ قرون وسطی کا ہندوستانی سماج ایک حد تک مسلح سماج تھا۔ شہروں اور قصبوں میں اشرافیہ اس طرح تلوار لے کر چلتے جیسے آج کل ہاتھ میں چھڑی لے کر چلتے ہیں۔ دیہہ یا گاؤں میں چند لوگ ہی ایسے ہوتے جن کے ہاتھ میں کم سے کم تیر کمان اور نیزہ نہ ہوتا۔ مسلح کسان بہلیہ، بہدریا، بچگوٹی، منڈاہر اور تومر راجپوتوں کو ابتدائی زمانے میں دستے مہیا کرتے اور آخری دنوں میں جاٹوں، مرہٹوں اور سکھوں کو۔

ابتدائی زمانے میں چند برہم حکمرانوں بلبن اور محمد بن تغلق وغیرہ نے ان مفرورین کو جنگلوں میں بالکل اسی طرح کھدیڑا جیسے جنگلی درندوں کا تعاقب کیا جاتا ہے۔ محمد بن تغلق کو لوگوں کو غلام بنانے میں بڑی دلچسپی تھی یا پھر مسلمان بنا لینے میں۔ کسانوں کے فرار ہو جانے پر اس پر طیش کا دورہ سا پڑ جاتا۔ بہت سے حکم ان تو انہیں پکڑ کر جیل

PDF created with pdfFactory trial version www.pdffactory.com

قدرت، موسم اور استقلال ان کی پشتیبانی کرتے۔ امیر خسرو، ضیاء الدین برنی اور ودیاپتی اور بہت سے پندرہویں صدی کے وقائع نگاروں نے بیان کیا ہے۔ ''کہ مسلمانوں نے کس طرح بت پرستوں پر غلبہ پایا'' وہ بھی زبردست فوجوں کی مدد سے۔ (7)۔ لیکن آخرالذکر پہاڑوں میں قلعہ بند ہوجاتے۔ (یہاں تک کہ ناہموار سنگلاخ علاقوں میں) یا بانس کے درختوں کے جھنڈ میں جو ان کے لئے فصیل بن جاتے۔ ابن بطوطہ لکھتا ہے (8) دوسو سال بعد بابر بھی یہی کہتا ہے۔ ''میدانی علاقوں کے کئی خطوں میں خار دار جنگل اگتے ہیں جن کی اچھی پناہ گاہوں میں عوام۔۔۔ اڑیل باغی ثابت ہوتے ہیں۔۔۔'' تیمور نے جب ہندوستان پر چڑھائی کی تو وہ بھی ان جنگلوں کی مہیا کردہ پناہ گاہوں کا ذکر کرتا ہے۔ لوگوں کا دفاع، وہ رقمطراز ہے۔ ''جنگلات بنوں اور درختوں پر مشتمل ہوتا ہے، شاخیں اور بیلیں باہم مربوط ہوتی ہیں یوں دیہی علاقوں میں داخل ہونا دشوار ہوجاتا ہے۔۔۔ (جہاں) زمیندار اور شہزادے۔۔۔ جو ان جنگلوں کے قلعوں کے باسی ہیں۔۔۔ وہاں جنگلی جانوروں کی طرح رہتے ہیں۔'' (9) یہ سب کچھ سلطانوں اور ان کے صوبہ داروں کی اس پالیسی کے تحت ہو رہا تھا جو صدیوں تک مسلم حکمرانی میں جاری رہی جس میں غلام سازی اور مذہب کی تبدیلی کے جواب میں ہو رہا تھا۔ یہاں تک کہ ایک کمزور سلطان خضر خان اور جملہ سید حکمرانوں (۱۴۱۴ء۔۱۴۵۱ء) نے دوآب کیتھر کے دیہی علاقے کو بلا لحاظ لوٹا جب کہ وہاں کے راجاؤں اور زمین داروں نے جواب میں ویسے ہی بھسم کرنے والے اقدام کئے اس سے پہلے اختیار الدین بختیار خلجی کی طرح اور بہلول لودھی بھی ایک منچلا لٹیرا بن کر اپنے دھاووں میں اتنی قوت حاصل کر گیا اور اپنی لوٹ کھسوٹ اور مال غنیمت سے بہت بھاری قوت بن بیٹھا۔ گاؤں اور قصبوں کو پوری طرح تاراج کرنے کی پالیسی اس نے اس وقت تک جاری رکھی جب تک کہ وہ سلطان نہ بن گیا۔ عبداللہ کے بقول سلطان ضلع ہردوئی میں نمسار مسرک کو لوٹا اور ''اسے ایسا اجاڑا کہ جس میں ہمہ شمہ اور ناپسندیدہ عناصر تک غائب ہوگئے۔'' (10)۔ پندرہویں صدی کے اہم افغان صوبے دار جو بہار، غازی پور، اودھ اور لکھنو کے حاکم ہوئے ان کے پاس تیس سے چالیس ہزار تک غلام ہوتے۔ انہوں نے اس زمانے میں کیا آفت ڈھائی ہوگی صرف قیاس کیا جاسکتا ہے۔

فرار ہوکر جنگلوں میں پناہ لینا ہندوستانیوں کی جان بچانے والی ایک کامیاب حکمت عملی تھی جس کی بابر سمیت متعدد مشاہدین نے حمایت کی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ جب وہ آگرہ پہنچا ''تو وہاں نہ ہمارے لئے اناج تھا اور نہ ہمارے گھوڑوں کے لئے جوار تھی۔ جو ہمیں درکار تھی۔ گاؤں والے جارحیت پر تلے تھے اور ان کی نفرت چوری چکاری اور رہزنی میں ڈھل چکی تھی۔ سڑکوں پر کوئی متنفس نہ تھا۔۔۔ تمام باشندے (خلایق) دہشت کے مارے فرار ہوچکے تھے (11) اور یہ بات فطری تھی کہ انہوں نے کہیں اور پناہ لے لی تھی۔'' کسی اور مقام پر وہ لکھتا ہے کہ ''ہندوستان میں۔۔۔ گاؤں اور قصبے لمحہ بھر میں آبادی سے خالی ہوجاتے اور اسی طرح بس جاتے ہیں۔۔۔ اگر وہ (باشندے) کسی جگہ پر اپنی نگاہ ٹکالیتے ہیں جہاں انہیں بسنا ہو۔۔۔ تو وہاں پر وہ تالاب بناتے ہیں یا پھر کنواں کھود لیتے ہیں۔۔۔ خاص گھاس کی فراوانی ہے، لکڑی کی کوئی کمی نہیں جھونپڑیاں بنالی جاتی ہیں اور دیکھتے دیکھتے گاؤں یا قصبہ نمودار ہوجاتا ہے۔'' نہ تو یہاں جنگلات کی قلت ہے اور نہ ہی پانی کی۔ (12) دیہی علاقے قلعوں اور گڑھیوں سے پٹے پڑے ہیں ان میں سے بہت سے ناقابل رسائی جنگلات میں پائے جاتے ہیں، چند ایک محض مٹی کی چاردیواری میں ہیں لیکن اس کے باوصف یہ سب مخالفت اور بےچینی کی عمومی روایت کے مراکز ہیں۔ کیونکہ جتنا زیادہ جبر ہوگا اتنی ہی مزاحمت بڑھے گی۔ یہاں تک کہ سترہویں صدی کے شہنشاہ جہانگیر نے اعتراف کیا کہ '' غیر مطمئن اور شورش پسند لگتا ہے کبھی کم نہ ہوں گی۔ اس لئے کہ میرے والد نے اپنے عہد میں جو مثالیں قائم کی تھیں اور جن پر بعد میں میں نے عمل کیا۔۔۔ میری شہنشاہیت میں یہ مشکل کوئی ایسا صوبہ ہوگا جس کے کسی نہ کسی حصے میں کوئی چھٹا ہوا کمبخت کہیں سے نکل نہ پڑے اور بغاوت کا پرچم لہرادے۔ اس لئے ہندوستان میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ہندوستان میں مکمل سکون کا دور گزرا ہو۔ (13)۔ مختصراً ایسے سماج میں ''لاکھوں مسلح افراد'' ڈرک ایچ کاف کے خیال میں ''چاہے وہ کاشتکار ہوں یا کوئی اور وہاں (حکومت) کی رعایا کے بجائے حریف رہے ہیں۔ (14)۔ اول الذکر ان پر کھلم کھلا حملہ کرتی اور آخرالذکر اکثر اپنے جنگل کی پناہ گاہوں سے نکل کر انہیں دفع کردیتے۔ جو جنگل میں چھپے ہوتے وہ وہیں مقیم رہتے جنگلی پھل کھاتے، درختوں کی جڑیں اور جب دستیاب ہوتا موٹا اناج کھاتے۔ (15)۔ لیکن یہ طے ہے کہ ہمہ وقت اپنی آزادی کی حفاظت کرتے۔

خلاصہ کرتے ہوئے، بہت سے زمیندار اور کسان جنگلوں میں اس لئے پناہ لے لیتے کیونکہ انہیں شکست اور غلام بن جانے کا خوف ہوتا لیکن مرور زمانہ کے ساتھ ان کی حیثیت گھٹتے گھٹتے ذیلی ذاتوں کی ہوگئی، اسی طرح ذیلی قبیلے اور پسماندہ طبقے۔ مثلاً بہت سے پری ہرما' پرمار جو کسی زمانے میں مغرور راجپوتوں کی ذاتیں تھیں آج کل نچلی ذاتوں میں شمار ہوتے ہیں۔ اسی طرح جنوبی ہند کے راجپوت ان دنوں پسماندہ درجے کہے جاتے ہیں۔ اب تراؤ علاقے کی تھارو عورتوں کا معاملہ لیجئے جن کا ذکر ہیوا ور کولین گانٹزر نے کیا ہے۔ ''ایک زمانے کی بات ہے۔'' ۔۔۔ سسوڈیا راجپوتوں کی حسین شہزادیوں کے ایک جتھ کو ان کے شفیق باپ نے اپنی سلطنت کی حدود میں سے بڑی عجلت میں رخصت کردیا اگرچہ وہ بوڑھا میدان جنگ میں جان دینے پر کمربستہ رہتا جس میں اعزاز اور عزت ملے۔ لیکن وہ یہ برداشت کرنے کو تیار نہیں تھا کہ اس کی تمام حسین لڑکیاں آگ میں کود کر جوہر میں جان دے دیں۔ اس نے اس لئے نہایت بہادر مصاحبین کو طلب کیا اور انہیں ان شہزادیوں کی حفاظت کرنے کی ذمہ داری سونپی اور انہیں بھیل جنگجوؤں کا ایک دستہ دیا اور انہیں کسی دور کی ہمالیائی سلطنت کی طرف جس سے اس کا خونی رشتہ تھا ان کی حفاظت کی غرض سے روانہ کیا۔ وائے نصیب اس پر صعوبت سفر میں تمام مصاحبین کو ملیریا اور دیگر لاغر کرنے والی بیماریوں نے جو ترائی کی دین ہوتی ہیں گھیر لیا۔ بالآخر جب آخری راجپوت مرد مرچکا تو شہزادیوں کو یہ احساس ہوا کہ اب آگے کا سفر ممکن نہیں ہے۔ نہ ہی بھیلوں کا دستہ آگے کے راستے سے واقف تھے اور مصاحبین پر بیماری کا حملہ ایسا اچانک تھا کہ وہ ہذیان میں مربوط گفتگو نہ کرسکے۔۔۔ وہ جوان عورتیں تھیں جن میں جوانی کی امنگیں کوٹ کوٹ کر بھری تھیں، وہ مرنا نہ چاہتی تھیں۔ اس لئے انہوں نے بھیلوں سے ایک سمجھوتہ کیا کہ ہم لوگ یہیں بس جاتے ہیں اور ترائی کے جنگل کو صاف کرکے قابل رہائش بنالیتے ہیں۔ تم سے شادی بھی کریں گے مگر ہماری ایک شرط ہے۔ اسی دن سے آئندہ تمام اناث اولاد پیدا ہونے والے مردوں سے ہمیشہ برتر ہوگی۔ وہ ان کے لیے کھانا پکائیں گی، ہاں اس لئے کہ یہ ریت ہے اور ہمیں تو اپنے لئے کھانا پکانا ہی ہے۔ اس لئے وہ ان کے واسطے بھی کھانا پکائیں گی لیکن کھانا ان کے سامنے نہ رکھیں گی اور یہی قرینہ اب تک چلا آرہا ہے۔ اپنے مردوں کے لئے تھارو عورتیں کھانا ضرور پکاتی ہیں۔ لیکن وہ کھانے کی تھالی کو

PDF created with pdfFactory trial version www.pdffactory.com

کی سب سے ممتاز چیز ان کا چمکدار زردوزی کا گھا گھرا اور ایسی چولی ہوتی ہے جس میں پوری پیٹھ کھلی رہتی ہے۔ مختلف دھاتوں کی بنی چوڑیوں سے ان کے بازو چھپے ہوتے ہیں اور ٹخنے بھی (جن سے ان کا راجپوتی حسب نسب ظاہر ہوتا ہے)۔۔۔ یہ خواتین نہ تو اطاعت شعار تھیں اور نہ ہی چاپلوس (قسم) کی جیسی ہمیں عموماً شمالی ہند کے دیہات میں ملتی ہیں۔ وہ پُرافتخار اور فعل مختار عورتیں تھیں۔(16)۔

ہمیں گاؤں گاؤں ہیو اور کولین گانٹزر کی طرح اس قسم کی عورتوں سے ملنے کے لئے گھومنا پڑے گا جو ہر جگہ ملتی ہیں۔ آج کل (دیگر پسماندہ کلاسیز) OBC اور St/Se سب مل کر ہندوستان کی مجموعی آبادی کا ۵۰% ہیں۔ یہ ہوشربا تعداد عالم وجود میں تاریخی قوتوں کی وجہ سے آئی جو قرون وسطی سے اساسی طور پر کارفرما ہیں۔ مسلم حکمرانی پورے ملک میں پھیل گئی۔ ہندوؤں کی مزاحمت بھی پھیلتی چلی گئی۔ ملک کے طول وعرض میں جنگلوں کی بہتات تھی جو گجرات سے بنگال وہاں سے کشمیر اور جنوب میں کنیا کماری تک تھے اور ان میں پناہ لینا محفوظ ترین حربہ تھا۔ اسی لئے St/Se لوگ ہر صوبے میں بڑی تعداد میں ملتے ہیں۔ قرون وسطی میں اور جبر واستبداد کی صدیوں میں، جنگلوں کے دیہات میں اور کچے پکے گھروں میں وہ وحشی جانوروں کی طرح رہتے تھے۔ کٹے ہوئے اور الگ تھلگ مصیبت زدہ اور جان لیوا جدوجہد میں مبتلا۔ لیکن جنگلوں میں بسیرا کرنے والے قرون وسطی کے یہ جنگ آزادی کے جانباز اس قابل تھے کہ انہوں نے اپنا دھرم اور تمدن محفوظ رکھا۔ ان کے حربی فنون اکھاڑوں میں محفوظ رہے اور کئی صوبوں میں آج بھی یہ کئی شکلوں میں رائج ہے۔

بن گاؤں کے باسیوں نے چاہے مفرورین ہوں یا مزاحمت کرنے والے انہوں نے ناقابل بیان محرومیاں برداشت کیں۔ اس کے باوجود انہیں یہ اطمینان قلب حاصل تھا کہ وہ اپنی آزادی کی حفاظت کر سکتے ہیں۔ لیکن جارحیت کے مارے تمام لوگ اتنے خوش قسمت نہ تھے۔ بہت سے گروہ اور افراد مسلم حملہ آوروں کے چنگل میں آنے سے نہ بچ سکے اور نہ ہی ان کے حکمرانوں کے استبداد سے: وہ بالعموم پکڑے جاتے اور غلام بنا لئے جاتے۔ یوں آٹھویں صدی عیسوی کے محمد بن قاسم سے لے کر اٹھارہویں صدی کے احمد شاہ ابدالی تک غلام سازی ان کی تقسیم اور اسیران کی فروخت کو مسلم فاتحین اور حکمرانوں نے باضابطہ جاری رکھا۔(17)۔ امیر خسرو کے پائے کے صوفی نے عاشقہ میں یہ لکھا۔ ''اگر شریعت نے جزیہ کے ادا کرنے کے بعد سزائے موت سے مستثنی نہ کر دیا ہوتا تو ہر ہندو کا نام اس کی جڑیں اور شاخیں تک نیست و نابود ہو جاتیں۔'' چند سال کے بعد انہوں نے بڑے اصرار سے کہا۔ ''ترک جب چاہیں ہندو کو پکڑ لیں، خرید لیں یا پھر بیچ ڈالیں۔(18)۔ اگر حکمران اشرافیہ کے کسی فرد کا یہ انداز فکر تھا جس کی وضاحت معروف صوفی نے کی تھی تو ہندوؤں کی بے دست و پائی اور غلام سازی کا خطرہ حقیقتاً بہت مہیب تھا۔

ہندو علم وحکمت پر حملے:

ہندوؤں کو غلام بنانا یا پھر ان کا مذہب تبدیل کرانا کہیں زیادہ آسان ہوتا اگر ان کے اشرافیہ دانشوروں کو جو سماج کے رہنما بھی تھے زیر کر لیا جاتا ساتھ ہی رائج غیر اسلامیہ تعلیم کو کچل دیا جاتا۔ اسی لئے مسلم حکمرانی کے آغاز میں پروہتوں، بھکشوؤں، برہمنوں اور بدھ تعلیمات کے اساتذہ کو عموماً قتل کرا دیا جاتا اور ان کے کالجوں اور جامعات کو تاراج کر دیا جاتا۔

مثال کے طور پر مسلم حکمرانی کے ابتدائی برسوں میں اختیار الدین بختیار خلجی نے بہار میں واقع بدھ یونیورسٹی کو تاراج کیا (۱۱۹۷ء-۱۲۰۲ء) وہاں پر عصری وقائع نگار منہاج سراج کے بقول ''اس جگہ میں آبادی کی اکثریت برہمنوں پر مشتمل تھی اور تمام برہمن اپنے سروں کو منڈواتے تھے (غالباً بدھ بھکشوؤں کو غلطی سے برہمن سمجھ لیا گیا) اور سب ہی قتل کر دیے گئے۔ وہیں بہت سی کتابوں کا بھی ذخیرہ تھا: اور مسلمانوں ۔۔۔ نے متعدد ہندوؤں کو طلب کیا کہ ممکن ہے وہ ان کتب کی اہمیت کے متعلق بتائیں لیکن وہاں کے تمام ہندو مارے جا چکے تھے'' حملہ آوروں کو صرف یہ معلوم ہو سکا کہ ''پوری گڑھی ایک کالج تھی جسے ہندی مین کالج (مدرسہ) اور بہار کہا جاتا تھا'' (19)۔ اس زمانے میں پورے ہندوستان میں علم وحکمت کے بہت سے مراکز کام کر رہے تھے۔(20)۔ بہار میں خلجی جنگجوں نے اتنے وسیع پیمانے پر قتل عام کیا تھا اور اسی طرح دیگر جگہوں پر بعد والوں نے کہ ایسے لوگ جو قدیم مخطوطات پڑھ سکتے تھے وہ اگر چہ ختم تو نہ ہوئے تھے مگر نادر ضرور ہو چکے تھے۔ اس لئے جب سلطان فیروز شاہ تغلق (۱۴ویں صدی) نے اشوک کی دو لاٹھوں کو خضر آباد اور میرٹھ سے اکھڑوا کر اس لئے منگوایا تا کہ انہیں دہلی میں نصب کرایا جائے تو اس نے چند برہمن عالموں کو طلب کیا تا کہ وہ اشوک عہد کی براہمی/پالی زبان میں کندہ کی ہوئی تحریروں کو جو لاٹھوں پر نقش تھیں پڑھیں۔ وہ ان تحریروں کو نہ پڑھ پائے۔ ان میں سے چند ایک نے سلطان کو خوش کرنے کے لئے مرغ اور بیل کی کہانیاں بیان کر دیں اور یہ کہا کہ ان نقوش میں یہ درج ہے کہ کوئی بھی اس لاٹھ کو نہ ہٹا سکے گا یہاں تک کہ فیروز کا ظہور ہوگا۔(21)۔

یوں لگے گا کہ وہ تمام چھوٹے بڑے قتل عام جیسے اختیار الدین نے کرائے تھے ان کی وجہ سے کوئی ایسا پنڈت یا بھکشو نہیں بچا تھا جو اشوک کا براہمی رسم الخط کو صدیوں تک پڑھ سکے۔ ہندو علوم کا جبراً دبا دیا جانا ''وہ بھی مدرسوں اور بت پرستوں کے مندروں کو مسمار کر کے۔'' یہ وطیرہ زیادہ تر مسلم حکمرانوں کے دور حکومت میں اورنگ زیب کے عہد تک جاری رہا۔ اشوک کے فرامین پورے ملک میں بکھرے ہوئے تھے اور جیسا تجربہ فیروز تغلق کو ہوا تھا انہیں پڑھنے والا کوئی نہ تھا۔ اسے انیسویں صدی کے ماہر آثار قدیمہ اور ناظم ٹکسال پرنسپ کے لئے اٹھا رکھا گیا کہ وہ اس خط مرموز کو کھولے اور دنیا کے سامنے عظیم شہنشاہ اشوکا کے زریں کارناموں کو دکھائے۔ مسلم حکمراں بالعموم اور فیروز تغلق اور سکندر لودھی بالخصوص برہمنوں کو ''بت پرستوں کے علمی خزانے کی کنجیاں سمجھتے تھے اور جن پر ہندو گہرا اعتماد کرتے ہیں۔'' (22)۔ اس لئے وہ ان سے نہایت سختی سے پیش آتے۔ برہمن جو ہندو سماج کے پیشوا تھے وہ ہندوستان کے مسلمان ہو جانے میں واقعی مانع تھے۔ اگر انہیں کچل دیا جائے تو لوگوں کا مذہب بدلنا آسان ہو جائے گا۔

غلام سازی ایک نہایت کامیاب مذہبی سرگرمی تھی:

PDF created with pdfFactory trial version www.pdffactory.com

روز افزاں مسلم آبادی میں اضافہ ہوتا تھا۔'' (23)۔ ہر سلطان اپنی دانست میں اسلام کا داعی بن کر اسے ایک سیاسی ضرورت سمجھتا کہ یا تو وہ ہندوستان میں مسلم آبادی میں اضافہ کرنے کے لئے تولد و تناسل کرے یا پھر تعداد بڑھائے جس سے پورا ملک اسلام قبول کرے گا یوں مقامی مزاحمت کا انسداد ہو جائے گا۔ (24)۔ جنگ میں غلام سازی سے اسلام کا فروغ ہندوستان میں کوئی نئی بات نہیں تھی۔ یہی نظام ہر اس جگہ پر نافذ رہا جہاں بھی مسلم حکمرانی کا وجود تھا۔ پورے عہد وسطی میں اسلام کی فتوحات اور جارح جنگیں عام بات ہوتیں جن میں غلام پکڑے جاتے اور مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا۔ کسی خاص لمحے پر یا دیگر اوقات میں مسلم حملہ آوروں اور فاتحین کی اکثریت خود بھی غلام رہ چکی تھی۔ اور یہی غلام ساز بادشاہ اور امراء اس نوعیت کی دست نگر ملکیت سے مسرت کشید کرتے مذکورہ بردہ ملکیت امراء پر گزرنے والے مصایب اور تلخیوں کو فراموش کرنے میں مدد ہوتی ہوگی۔ اپنے لاتعداد کنبوں خصوصاً دیہی جائے دادوں میں وہ غلاموں کی شادیوں کی اس لئے ہمت افزائی کرتے تھے جس سے مسلمانوں کی آبادی میں اضافہ ہوتا تھا۔ جب کہ دوسری جانب جب اسیران اسلام سے ایک مرتبہ مطابقت پیدا کر لیتے یا مطیع ہو جاتے (جس کے متعلق کسی بھی حالت میں ان کے پاس تیسرا راستہ نہ ہوتا) تو ان کے ترقی کرنے کے لئے کئی دروازے ہوتے اور مواقع پیدا ہو جاتے۔ ایڈورڈ گبن کی جو مرصع زبان میں ''کسی جملے کے دہرا دینے اور غلفہ گنوانے سے کوئی پرجا یا غلام، اسیر یا مجرم لمحہ بھر میں آزاد ہو کر فاتح مسلمانوں کا ہم پلہ ہو جاتا تھا'' (25) حالانکہ یہ آزادی اور مساوات یکا یک نہیں مل جاتی تھی۔ ان کی غلامانہ فطرت کے مٹنے میں تین یا چار پشتیں لگ جاتیں۔ جو مذہب کی تبدیلی کا صلہ ہوتا۔ غلامی کے باوجود ایک احساس آزادی پروان چڑھنے لگتا اور اس بات کا گھمنڈ بھی پیدا ہو جاتا کہ ''ہم'' حکمران طبقے'' سے تعلق رکھتے ہیں۔ چند نسلوں کے بعد ہندوستانی مسلمان ان کوائف کو بھول جاتا جن سے ان کے پرکھے غلام بنائے گئے تھے اور مسلمان بنا لئے گئے تھے۔ وہ اپنے نئے عقائد پر فخر کرتا کیونکہ اس نے اس کے واسطے ترقی کے نئے ایوان کھولے تھے جس سے اسے حکمرانوں یا آقاؤں کی دولت اور لوٹ مار میں حصہ ملنے لگتا۔ اور اس لئے غلام سازی اور تبدیلی مذہب چولی دامن کی طرح چلتے رہے۔ (26)

غلاموں کے پکڑنے کے کئی ڈھنگ تھے، یلغار کرنا یا جنگ کرنا نہایت سود مند ذریعہ تھا۔ مسلم حکمرانوں کے یہ بات سمجھ میں آ گئی کہ کبھی کبھار اور چھوٹی مہموں میں پکڑے جانے والے غلاموں کی فصل اچھی ہوتی ہے اگر وہ بہتر نہ سہی جیسا کہ بڑی مہموں میں ہوتا ہے۔ اس میں کوئی برائی نہیں ہے اگر جنگی کاروائی چھوٹے پیمانے پر کی جائے۔ یوں ایک دیرپا دباؤ کے سبب ''بت پرست اسیران ممکن ہے جھوٹا مذہب ترک کر کے اسلام قبول کر لیں۔'' (27)۔ یہ سب کچھ محمد بجد خانی نے لکھا جو آغاز میں خود بھی غلام تھا (جیسا کہ نام خانی سے ظاہر ہوتا ہے)۔ ان جنگوں کے سیاق میں جو سلطان فیروز تغلق کے مرنے کے بعد ہندستان میں ہوئیں۔ سید حکمرانوں نے اپنے اختیارات کو مستحکم کرنے کے لئے دباؤ ڈالا (۱۴۱۴ء۔۱۴۵۱ء) جس کے نتیجے میں کیٹھر، خور کا مپل، سکیت، بدایوں، راپڑی، جلیسر، چندواڑ، اٹاوہ وغیرہ کی مہمیں بھی درپیش آئیں۔ (28)۔ ان تمام علاقوں میں خصوصاً کیٹھر دوابہ کے علاقہ میں مسلم فوج نے صرف اس پر قناعت کی ''جو اگر چہ شرمناک تھی مگر جس میں لوگوں کو محض لوٹ کر تشفی ہوتی تھی۔'' اور مفتوحہ علاقوں پر اندھا دھند تباہی پھیلاتے اور لوگوں کو غلام بناتے۔ (29)۔ دریں اثنا شیخ علی جیسے غیر ملکی جو کابل میں منگول صوبہ دار تھا جب اس نے لاہور پر حملہ کیا'' تو اس نے بہت سے لوگوں تہ تیغ کرنے کے بعد بہت سے لوگوں کو اسیر بنا لیا۔ (30)۔ ان لگاتار مہموں کے درمیان میں مسلمان قیدیوں کو کبھی کبھی رہا کر دیا جاتا لیکن بت پرستوں کو نہیں جنہیں غلام بنا لیا جاتا یا پھر مسلمان۔ (31)

لودھیوں نے جنہوں نے بتدریج سلطنت کا دبدبہ از سر نو بٹھایا (۱۴۵۱ء۔۱۵۲۶ء) غلام بنانے کا کاروبار بدستور جاری رکھا۔ بہلول لودھی خاندانی کئی سلطنت کا بانی تھا ''لٹیرا بنا اور لوٹ کھسوٹ سے پھر بڑی قوت بن بیٹھا'' (32)۔ اگر ایک حکمران بہلول نے نمسار (جو ضلع ہردوی میں تھا) پر اپنی فوج سے چڑھائی کی، اور جگہ کو خوب لوٹا اور وہاں کی آبادی کا قتل عام کر کے اسے اجاڑ ڈالا اور وہاں کے لوگوں کو غلام بنا لیا۔ (33)۔ تو اس کے جانشین سکندر لودھی نے وہی سب کچھ ریوا اور گوالیار کے خطوں میں کیا۔ (34)

پندرھوں صدی عیسوی کی تبدیلی مذہب کے لئے کی جانے والی کدوکاوشیں جو بذریعہ غلام سازی ان علاقوں میں چلتی رہیں جہاں مسلم حکمرانی تھی اگر چہ وہ خطے دہلی سلطنت سے ٹوٹ کر خود مختار بادشاہتیں بن چکی تھیں جیسے کہ گجرات، مالوہ، جون پور، خاندیش، بنگال اور دکن۔ ان کی تفصیلی روداد میری دو کتابوں میں مل سکتی ہے۔ (35)۔ اور آپ میں سے جسے معاملے کو کھنگالنا ہے اسے ان کا مطالعہ کرنا پڑے گا۔ بات عیاں ہے کہ مذکورہ کتابوں کا الف سے ی تک کا حوالہ یہاں نہیں دیا جا سکتا حالانکہ اس سیاق میں وہ بہت برمحل ہوگا۔ تاہم ان میں سے ایک کتاب کا ایک یا دو صفحے کو دہرا دینا دو وجوہ سے مناسب ہے۔

(۱) موجودہ بیان میں کوئی بڑا سا خلاء نہ رہ جائے۔

(۲) جنوبی ہندوستان میں غلام سازی کا ایک دھندلا سا انداز بیان کر دیا جائے۔

کیونکہ ہم نے گذشتہ صفحات میں ابھی تک کم وبیش شمال پر توجہ دی ہے۔ ''پہلا بہمنی بادشاہ علاء الدین بہمن شاہ (۱۳۴۷ء۔۱۳۵۸ء) نے شمال کے کناٹک ہندو سرداروں کے خلاف ایک مہم روانہ کی اور اس کے ہاتھ جو مال غنیمت آیا اس میں ۱۰۰۰ گانے اور ناچنے والی لڑکیاں (مرلیاں) بھی ہندو مندروں سے ہاتھ آئیں۔ (36)۔ سن ۱۴۰۶ء میں سلطان تاج الدین فیروز (۱۳۹۷ء۔۱۴۲۲ء) نے وجے نگر سے جنگ لڑی اور اس کے پورے علاقے سے اسے ۶۰۰۰۰ جوان اور بچے ہاتھ لگے۔ جب امن بحال ہوا تو بکا نے دیگر اشیا کے علاوہ ۲۰۰۰ لڑکے اور لڑکیاں دیں جو ناچنے اور گانے میں مہارت رکھتی تھیں۔ (37)۔۔۔ اس کا جانشین احمد ولی (۱۴۲۲ء۔۱۴۳۶ء) سلطنت وجے نگر میں سے دھاوا کرتا ہوا نکلا ''مردوں کو قتل کراتا جاتا اور عورتوں بچوں کو غلام بنائے جاتا۔'' (38)۔ صیدوں کو مسلمان بناتا گیا۔ (39)۔ سلطان علاء الدین (۱۴۳۶ء۔۱۴۵۸ء) نے اپنے حرم میں ایک ہزار عورتیں جمع کر لیں۔ جب یہ مد نظر ہو کر بہمنی اور وجے نگر بادشاہوں کے مابین کوئی ڈیڑھ سو سال تک وقفے وقفے سے جنگیں ہوتی رہیں تو پھر غلام سازی اور تبدیلی مذہب کی داستان بھی لازماً رک جانا چاہئے تھی۔ حد یہ ہے کہ عام سپاہی تک کو کئی کئی غلام مل جاتے اور تالی کوٹ (۱۵۶۵ء) کی لڑائی کے ختم ہونے پر ''اسیروں کی بہت بڑی تعداد کو غلامی کا منہ دیکھنا پڑا، جس سے مسلم افواج مالا مال ہو گئیں، کیونکہ فوجی دستوں کو اس کی اجازت تھی کہ وہ پورے مال غنیمت کو رکھ

PDF created with pdfFactory trial version www.pdffactory.com

مغل شہنشاہ اکبر نے زمانہ جنگ کے دوران میں عورتوں اور بچوں کو غلام بنانے کے دستور کو منظور نہ کیا۔(42)۔اس نے ان کسانوں کی عورتوں اور بچوں کو غلام بنانے اور فروخت کرنے کی بھی ممانعت کر دی جو مالگذاری ادا نہ کر پاتے ہوں۔ جیسا کہ ابوالفضل بیان کرتا ہے کہ عالم پناہ کو معلوم تھا کہ بہت سے بدطینت اور برے لوگوں کی عادت ہے کہ وہ گاؤں گاؤں اور محلوں میں گھوم کر انہیں لوٹتے اور غارت گری کرتے ہیں۔(43)۔مور لینڈ کے مطابق ''کسی گاؤں پر دھاوا بولنا ایک فیشن بن چکا تھا یا بغیر کسی جواز کے دیہات پر اور وہاں کے باشندوں کو لے اڑنا اور غلام بنالینا۔''(44)۔یہ برمحل لگتا ہے کہ اس بیان کو ویز اڈ ایلسٹ کے رمزیہ بیان سے نتھی کر دیا جائے کہ'' اس عہد کی باقیات میں سے ایک شمالی ہندوستان میں رات گئے شادی کی تقریب برپا کرنے کی روایت ہے یہ ایک احتیاطی چال تھی جس سے دلہن لے بھاگنے کے اسلامی کھیل سے بچا جاتا تھا۔''(45)۔جہانگیر نے بھی مشاہدہ کیا اور کہا'' کہ کوئی سرکاری محصولات وصول کرنے والا یا جاگیردار اس کی اجازت کے بغیر جس پرگنہ میں وہ ہو وہاں کے لوگوں میں شادی نہ کرے(46) کیونکہ اغوا اور جبری شادیاں بہت عام بات تھیں۔لیکن غلام سازی کی پالیسی ترک کرنے کا کبھی خیال بھی نہ آیا جس کا خاص سبب مغل شہنشاہ نہ تھے بلکہ مغل امرا کا طبقہ تھا جو غلام سازی ملک بدری اور مملکت کی فروخت میں بڑا حصہ لیتے تھے۔اس کا تعلق صرف جہانگیر ہی سے نہ تھا جو مقابلتاً ایک رحم دل شہنشاہ گزرا ہے وہ اپنی شکاری مہموں کے درمیان میں غریبوں کو پکڑ لیتا اور انہیں کابل روانہ کر دیتا تاکہ ان کے عوض کتے اور گھوڑے منگوائے جائیں۔تمام مسلم حکمرانوں اور صوبیداروں کا معمول تھا کہ وہ غلاموں کو پکڑواتے اور جیسا جی چاہتا ان کا استحصال کرتے۔شاہجہان کے عہد میں جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ کسانوں کو مجبور کیا جاتا تھا کہ وہ اپنی عورتوں اور بچوں کو بیچ کر مالگذاری ادا کریں۔

کچھ بھی کہیے اگر جہانگیر اور مغل سپہ سالاروں کے تحت معمول کے مطابق جنگ وجدل جاری رہی جس میں شہنشاہوں کی کمزوریاں بھی تھیں جن کے اقتدار کی گرفت بھی بہت موثر نہ رہی۔عبداللہ خان از بیگ ۱۲۰۰۰ گھڑسوار اور ۲۰۰۰۰ پیادہ فوج سے کالپی قنوج علاقے میں تمام قصبوں اور کل اشیا پر قابض ہو گیا،ان کی عورتوں اور بچوں کو غلام بنالیا وہاں کے ممتاز افراد اور سربراہوں کی گردنیں قلم کرا دیں جنہیں لافانی بنانے کی خاطر (ان کے بریدہ سروں کو دیواروں اور ستونوں میں مسالے سے نصب کرا دیا) چن دیا گیا۔اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ہے کہ اس نے ایک مرتبہ کہا'' میں نے کوئی پانچ لاکھ مردوں عورتوں کو بیچ ڈالا، وہ سب مسلمان ہو گئے۔روز قیامت تک ان کی ذریت بڑھ کر کروڑوں ہو جائے گی۔(48)

PDF created with pdfFactory trial version www.pdffactory.com

باب۔۷

غلام امرا کے درمیان حصول اقتدار کی کشمکش

عبداللہ خاں کا قول پیمبرانہ نکلا۔ ہندوستانی مسلمانوں کی تعداد غلامی کے سبب بڑی تیزی سے بڑھی۔ اس تیز رفتار اضافے نے چند نئے مسائل کو جنم دیا۔ ان میں سے ایک غیر ملکی غلام ملوک، اور ہندوستان نژاد غلاموں کے مابین اقتدار کے لئے کشمکش تھی جن میں سے چند نے امرا کا مرتبہ حاصل کرلیا تھا۔ جہاں تک ترک امیروں کا باہمی معاملہ تھا، غیر ملکی ترکوں اور ہندوستانی مسلمانوں کے درمیان بالادستی کی خونخوار رسہ کشی بھی جاری رہتی۔ جب کہ ہندو غلام سازی اور تبدیلی مذہب سے بچنے کے لئے مزاحمت کرتے رہتے۔ لیکن جب ایک مرتبہ مسلمان بن جاتے تو پھر وہ بھی غیر ملکی مسلمانوں کے مقابلے میں مساوات اور برابری پر اصرار کرنے لگتے۔ دونوں کے درمیان موجود امتیاز ہمیشہ سے موجود تھا جس کا اظہار قرون وسطی کے وقایع نگاروں منہاج اور برنی کی تحریروں میں جھلکتا ہے اور فرنگیوں لیع نی آغ اور رابرٹ اورے (۱) کے مشاہدات میں بھی ملتا ہے۔ ترکوں کا دعویٰ تھا کہ ان کا تعلق اعلیٰ نسل سے ہے اور وہ ہندوستان میں مسلم حکمرانی کے بانی ہیں۔ ہندوستانی مسلمانوں کو معلوم تھا کہ ترک اچھے لڑاکا ہیں مگر انتظامی امور کے واسطے دیسی مسلمان زیادہ مناسبت رکھتے ہیں۔ انہیں نظم وضبط میں رکھنے کی خاطر سلطانوں کا دستور تھا کہ وہ صدیوں کا آزمودہ نسخہ یعنی ایک کو دوسرے گروہ سے الجھائے رکھتے۔ ایک موقع پر سلطان التمش نے تینتیس اہلکاروں کو اس لئے برطرف کر دیا کہ یا تو وہ نیچ ذات کے تھے یا پھر ہندوستان نژاد تھے۔ (2)۔ جب کہ دسری جانب سلطان ناصر الدین نے ہندوستانی نژاد امداد الدین ریحان کو وکیل دار (شاہی محل کے پھاٹکوں کی کنجیوں کا امین) کے منصب پر فائز کر دیا اور اس سے پہلے نہایت طاقتور غیر ملکی ترک غیاث الدین بلبن کو برطرف کر دیا۔ منہاج الدین سراج نے جو صورتحال بیان کی ہے کہ ان دنوں غیر ملکی ترکوں اور ہندوستانی "جولا ہے" امرا کے درمیان آگ پانی کی حالت پائی جاتی تھی۔ ملک اور سلطان کے دربار کے ملازمین سب ہی ترک تھے اور خالص نسل (ترکان پاک) تھے وہ لکھتا ہے، اعلیٰ نسل کے تازکان (تازکان گزیدہ وس؟) امداد الدین ریحان (جو) خصی اور مثلہ تھا اور اوپر سے ہندی قبیلے کا اور اعلیٰ نسل کے امرا کے سروں پر حکمرانی کر رہا تھا اور وہ سب کے سب اس حالت کو بہ کراہت جھیل رہے تھے اور ان سے یہ ذلت کسی حالت میں برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ (3)۔ ترک امرا نے تلواریں سونت لیں اور سلطان کو ترغیب دی کہ وہ ریحان کی برطرفی کا حکم جاری کرے اور الغ خان اعظم بلبن (فروری ۱۲۵۴ء) کو بحال کرے۔ ضیاء الدین برنی کی زبان اس وقت کوئی کم دشنامی نہیں ہے۔ وہ ترکوں کی نسل برتری کا گہرا عقیدہ رکھتا تھا ساتھ ہی ہندوستانی مسلمانوں کے ارذل ہونے پر۔ اس نے تجویز پیش کی کہ "ہمہ اقسام کے اساتذہ کو سخت ہدایات جاری کی جائیں کہ وہ قیمتی پتھروں کو کتوں کے حلق سے نہ اترنے دیں۔۔۔ یعنی گھٹیا لوگوں، کمینوں اور لاخیروں سے۔۔۔ نیچوں کو وہ کچھ نہ پڑھائیں الانمازوں کے قواعد، روزہ، دینی خیرات، مناسک حج اور اس کے ساتھ قرآن کے چند ابواب اور ایمان کے چند اصول۔۔۔ ان سب (ہندوستانی مسلمانان) کو لکھنا پڑھنا نہ سکھایا جائے کیونکہ نیچوں کو علم وحکمت حاصل ہو جانے سے بہت سی شورشیں جنم لیتی ہیں۔۔۔ نیچوں میں صرف بدی کا ارتکاب کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔۔۔ اسی لئے انہیں نیچ، لاخیرا، گھٹیا، بے غیرت اور ملچھ کہا جاتا ہے۔

اس افراتفری کے ماحول میں غیر ملکی غلام امرا ان ہندوستانی ہم عصروں پر فضیلت رکھتے تھے۔ وہ سلطان کے مقرب ہوتے اور اس پر اثر ورسوخ رکھتے تھے۔ چونکہ ہندوستان نژاد زیادہ تر مسلمان ابتدا میں غلام رہ چکے تھے "اسیروں کا بھیین جو ہزاروں کی تعداد میں بہ وجہ جنگ ہاتھ آتے یا پھر دمڑیوں کے بھاؤ خریدے جاتے۔" لیکن یہ بھی ترکوں کی طرح سازش اور دیگر داؤ پیچ سے کام لے کر اقتدار حاصل کر لیتے۔ ملک کافور اور ناصر الدین خسرو تو تخت تک کے دعویٰ دار بنے۔ کچھ بھی کہا جائے اس میں چند پیڑھیاں لگتیں تب کہیں جا کر وہ غیر ملکی امرا کے ہم مرتبہ ہو جاتے (4) مسلم سماج اس پر مائل رہتا ہے کہ تقسیم ہو کر حکمران اور دیگر طبقات میں بٹا رہے۔

اُمرا میں تصادم:

ایسا رویہ کہ "تجھ میں ایسا کیا ہے جو مجھ میں نہیں" ایسی خودسری صرف چند امرا میں نہیں تھی بلکہ تمام امرا اس میں مبتلا تھے چاہے وہ غیر ملکی ہوں یا ہندوستانی اور ہر زمانے میں۔ ترکوں کے علاوہ جو اکثریت میں تھے لیکن مختلف قبیلوں میں بٹے ہوئے تھے وہاں اہل ابی سینیا تھے افغانی (جن کے متعدد قبائل اور گروہ تھے) تاجک، ایرانی اور منگول تھے۔ (5)۔ یہ سب بہ حیثیت فرد اور گروہ پیوستہ مفادات رکھتے تھے ہر گروہ میں گھاگ اور تجربہ کار اور زندگی کے مصائب جھیلے ہوئے افراد تھے۔ جیسا کہ ان کے ناموں سے ظاہر ہے ملک قبول الغ خانی اناج کے بازاروں کا حاکم اعلیٰ (شہنائے منڈی) جو علاء الدین کے ماتحت تھا۔ محمد بجمد حمد خامی مورخ، جہانگیر قلی خان جہانگیر کا مشیر خاص اور مرشد قلی خان، بنگال کا صوبہ دار اور سب ہی غلام اور امیر بنے۔ تعجب نہ ہونا چاہیے کہ سازشیں جوڑ توڑ پورے عرصہ جاری رہیں اس کے علاوہ دانتا کل کل تلوار اور زہر خورانی کا حریفوں کو برباد کرنے کے لئے دھڑلے سے استعمال ہوا۔ (6)

ابتدا میں ترک غلاموں کی تعداد تو سب سے زیادہ تھی۔ اس کے علاوہ بہت سے قبیلوں سے تعلق رکھنے والے غلام جو مختلف نسلی گروہوں اور ممالک کے تھے ان کی آمد کا بھی تانتا بندھا رہا۔ چاہے وہ جنگ میں پکڑے گئے ہوں، خریدے گئے ہوں یا پھر بہلا پھسلا کر ہندوستان میں لائے گئے ہوں کہ یہاں ترقی کی بہت گنجائش تھی۔ یا پھر وہ مہم

PDF created with pdfFactory trial version www.pdffactory.com

ہنر وفن میں کمال رکھنے کی وجہ سے ان کی حیثیت غلام ہی کی ہوتی۔غلامی ایک ایسی شرط تھی جس سے کوئی مستثنیٰ نہ تھا۔جن میں علماء، شعرا۔ترک ہوں عرب، فرانسیسی، یہودی ایرانی ہوں یا اہل ایتھوپیا۔ایسی نوبتیں بھی آئیں جب ترک غلاموں کا تکبر ان کا حسد ان کی سازشیں اور ان کی خدمات کو ضابطہ تحریر میں لایا گیا۔قرون وسطی کے ہندوستان میں چند دیگر نمایاں گروہ بھی تھے جیسے افغان، ایرانی اور افریقہ کے سیاہ فام غلام۔جن میں اہبی سینیا یا ایتھوپیا والے بھی شامل ہیں۔ہمیں اس داستان کے متعلق محض ایک لفظ کہنے کی اجازت دیجئے وہ ہے ''درآمدی'' غلام کیونکہ ہم ان کا حوالہ مختلف سیاق میں بار ہا دیں گے۔

گیارہویں صدی عیسوی کے بعد افغانی بھی بطور نصیب ور سپاہی کے متعدد حملہ آوروں کی افواج کے ہمراہ یہاں آنے لگے، جس کا آغاز محمود غزنوی سے ہوا۔اپنی آخری مہم میں محمد غوری اپنے ہمراہ دس ہزار گھڑ سوار لایا۔(7)۔التمش کے عہد میں شہزادہ جلال الدین خوارزمی جس کا چنگیز خاں تعاقب کر رہا تھا اپنے ساتھ بہت سے افغان سپاہی لایا۔جن میں سے چند ایک نے التمش کی ملازمت کر لی۔(8)۔بلبن نے ہزاروں افغانوں کو دشوار اور دور دراز چوکیوں پر متعین کیا۔(9)۔سید خضر خاں نے جسے تیمور نے نامزد کیا تھا اپنی غیر مقبولیت اور ہندوستان میں حمایت نہ میسر آنے پر اہم عہدوں پر لودھیوں، شیروانیوں، نیازیوں، جلوانیوں اور روہ (10) کے دیگر افغان قبائل کو فائز کرنا پڑا۔ترک سلطانوں کی نظر میں افغانی اچھے سپاہی تھے۔مگر اجڈ۔ان میں بے لگام آزادی اور خیرہ سری موجود تھی۔اور ان کے اپنے قبیلے سے وابستگی کسی بھی قسم کے نظم و ضبط اور مربوطی کے واسطے مفید نہ تھی۔سلطان بہلول لودھی نے اپنے شورش پسند افغان امرا کو نہایت زیرکی سے مطیع بنا کر رکھا۔وہ جب بھی اپنے امرا کے لئے فرمان لکھوا تا تو وہ انہیں ''مسند اعلیٰ'' کہہ کر خطاب کرتا۔(11)۔جب سکندر لودھی کو انہیں ان کی حیثیت دکھانے کی ضرورت پڑی تو اسے بڑی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔اس کا بیٹا اور وارث تخت ابراہیم اپنا تخت ان کی سازشوں، سرکشی اور عدم اطاعت گزاری کے سبب گنوا بیٹھا۔اور مغلوں کی آمد تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔افغان حکمراں خود کو افغان قبیلوں میں گھرا رکھتے اور انہیں کو اہم عہدوں سے سرفراز کرتے۔

اہل ایران اور وسطی ایشیا (ایرانی اور تورانی) کے لوگوں کو بالعموم اونچے انتظامی عہدوں پر فائز کیا جاتا۔منہاج سراج کا کہنا ہے کہ ایران اور قرب وجوار کے ممالک کے لوگ مختلف حیثیتوں میں ہندوستان آتے۔فخر الملک عسامی جو بغداد میں تیس سال تک وزیر کے عہدہ پر فائز رہا لیکن پھر اسے وہاں کوئی مایوسی ہوئی اور ہندوستان چلا آیا جسے التمش نے اپنا وزیر اعظم مقرر کر لیا۔عہد التمش میں ایک بہت بڑا عالم امیر روحانی تھا۔وہ چنگیز خان کے حملوں کے زمانے میں بخارا سے دہلی آیا اسی طرح قاضی حمید الدین ناگوری کسی اور ملک سے آیا تھا۔محمد عوفی جو معروف کتاب جامع الحکایات کا مصنف ہے وہ بھی التمش کے عہد میں دہلی آیا تھا۔(12)۔جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ منگول آندھی کی وجہ سے التمش اور بلبن کے دربار میں عراق، خراسان، ماوراالنہر اور متصل ممالک کے کوئی چالیس سے اوپر شہزادے اپنے متوسلین کے ہمراہ آئے۔(13)۔ان پیروکاروں میں اہل قلم اور اہل سیف، مشائخ، مورخین اور موسیقار سب ہی تھے۔سلطان بلبن کے شاہی جلوس میں ۵۰۰ سیستانی، غوری، سمرقندی اور عرب سپاہ اُپنی تلواروں کے ساتھ بادشاہ کی معیت میں چلتے تھے۔یہی حال دہلی کے دیگر سلطانوں کا تھا۔جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عہد سلطنت میں بہت بڑی تعداد میں غیر ملکی ہندوستان آئے۔خصوصاً مغلیہ عہد میں انہوں نے بہت نام پایا۔بیرم خان جس نے مغلوں کی موروثی حکومت کو از سر نو مستحکم کرنے میں مدد کی وہ ایک ایرانی تھا۔جہانگیر اور شاہجہاں کے درباروں میں ایرانی امرا بہت اثر ورسوخ رکھتے تھے جس کا سبب ملکہ نور جہاں اور ممتاز محل کی حمایت تھی۔ایرانی اور تورانیوں کی ممتاز حیثیت کی بنیادیں بہت گہری تھیں۔

سیاہ فام افریقیوں کے شب وروز اور انجام کوئی اچھا نہ تھا۔ایک عمومی اصطلاح جس سے انہیں یاد کیا جاتا وہ حبشی یا اہل ابی سینیا کی تھی۔تھوڑے سے بلکہ چند ایک ہی اونچے مرتبے تک پہنچ سکے جیسے ملک یاقوت جو رضیہ سلطانہ کا ذاتی مصاحب ہوا لیکن ان کے متعلق ترکوں کے تحقیر آمیز رویہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان میں مسلم حکمرانی کے ابتدائی برسوں میں افریقیوں کی کیا حالت تھی۔بعد کے زمانے میں تاہم وہ جون پور کے شرقی بادشاہ بنے اور بنگال اور دکن میں بھی کئی بادشاہ بنے۔لیکن ان میں سے زیادہ تر کو کمتر مسلمان سمجھ کر سلوک کیا جاتا۔بنگال کا باربک بادشاہ (۱۴۶۰ء۔۱۴۷۴ء) نے اہل ابی سینیا کی بھاری تعداد کو اپنے تخت کی حفاظت کی غرض سے رکھا۔اس نے ۸۰۰۰ حبشیوں کو حکومت کے اونچے عہدوں پر تعینات کیا۔(14)۔گجرات اور دکن کے سلطانوں نے بھی اہل ابی سینیا کے گروہوں کو ''بااعتماد اور باعزت'' عہدوں پر متعین کیا۔(15)۔ابی سینیا سے زن ومرد غلاموں کو مغلوں کے واسطے بطور تحفہ لایا جاتا۔(16)۔حبشی عورتوں کو حرم کی حفاظت کے لئے بطور قلماقنی مالوہ اور دیگر بادشاہوں میں بھرتی کیا گیا۔لیکن حبشیوں کا سب سے بڑا ارتکاز دکن میں تھا جہاں انہوں نے کئی طاقتور سیاسی گروپ بنا لئے۔(17)۔قرآن اور شریعت میں رنگ ونسل کے تعصب کا کہیں شائبہ نہیں ملتا۔ساتویں صدی عیسوی کے آغاز میں نہ تو غلامی اور نہ ہی سنگین نسلی اور قومی حریفی نے یوں سر اٹھایا تھا جسے اس جدید دور میں نسلی تعصب کہا جاتا ہے۔تاہم ساتویں صدی کے اختتام تک کھال کی سیاہی ایک ایسی علامت بنتی جا رہی تھی جس سے بدذوقی اور تحقیر جھلکتی تھی۔اس جانب برنارڈ لیوس نے اشارہ کیا ہے اور جو نا قابل تردید شہادت جسے کہ نسلی غلامی سے جدید دنیا جانتی ہے اس نے قرون وسطی کے مسلم سماجوں میں جنم لیا تھا۔ہلکی رنگت والے عرب، بربر اور ایرانیوں نے دور دراز تک پھیلی ہوئی غلاموں کی تجارت کو جنم دیا جس میں لاکھوں قیدیوں کو جنوبی افریقہ اور اس سے متصل علاقوں سے اونٹوں کے کاروانوں پر صحراؤں سے پار کرایا جاتا یا پھر غلاموں کو جہازوں کے ذریعے مشرقی افریقہ سے خلیج فارس پہنچایا جاتا۔متنوع نسل کے لوگوں کو عرب درجہ بندی کرتے جو مشرق کی جانب راس افریقہ سے لے کر مغرب کی جانب گھانا تک کے ''کالے'' ہوا کرتے۔یہ ایک اکیلا ادنی گروہ تھا خصوصاً غلامی کے لئے مطیع اور فرماں بردار جیسا کہ چودھویں صدی کے عرب مورخ ابن خلدون کا کہنا ہے وہ ''انسانی (لازماً) اوصاف کم ہی رکھتے ہیں اور حرکات وسکنات میں بے زبان جانوروں سے ملتے ہیں!'' چند مسلم لکھنے والوں نے اہل نوبیا کو اور بالخصوص ایتھوپیا والوں کو ذلت کے مارے زنجیوں سے ذرا سا اوپر۔یہ ایک مبہم سی اصطلاح ہے جو بنٹو زبان بولنے والے مزدوروں کو کہا جاتا جنہیں مشرقی افریقہ سے درآمد کیا جاتا تھا۔مختصراً قرون وسطی کے مسلمانوں نے سب سے گھٹیا قسم کی محنت کو سیاہ فام غلاموں سے منسوب کر دیا۔حقیقت تو یہ ہے کہ عربی زبان میں غلام کے لئے ''عبد'' آیا ہے جس کے معنیٰ ''کالا غلام'' ہے۔(18)

PDF created with pdfFactory trial version www.pdffactory.com

ہمیں اکبر کی فتح گجرات میں نظر آتا ہے۔ احمد آباد کے سقوط کے بعد سلطان محمود گجراتی کے تمام افسران اکبر کی خدمت میں اظہار اطاعت کے لئے آئے۔ جن میں اعتماد خان بھی تھا'' وہ سلطان محمود گجراتی کا غلام اور وزیر اعظم تھا۔'' (19)۔ (جو ابتدا میں ایک ہندو غلام تھا)۔ (20)۔ میر ابوتراب، سید احمد بخاری، ملک اشرف، الغ خان حبشی، جہار خاں حبشی متعدد امرا اور گجرات کے دیگر سردار ''لا تعداد کہ ان کا ذکر کرنا دشوار'' ابوالفضل لکھتا ہے کہ شہنشاہ اکبر کی خواہش تھی کہ ان حبشیوں (اہل ایبی سینا) کو بطور شاہی غلام کے ان ہی شرائط پر رکھ لیا جائے جن قواعد کے تحت وہ سلطان محمود کی غلامی کرتے تھے۔ مگر اکبر کے افسران ان پر شک رکھتے تھے۔ اعتماد خان نے تمام گجراتی غلاموں کی ضمانت لے لی ایبی سینیا کے غلاموں کو چھوڑ کر (21) اس لئے حفاظتی نقطہ نظر سے اکبر نے حکم دیا کہ حبشیوں کے جتھوں کے سرداروں کو دربار کے اعلیٰ مرتبت افسروں کے ماتحت کر دیا جائے۔ (22)

ڈی۔ بی۔ ڈیوس اپنی کتاب (Slavery and Human Progress) میں ایک تخمینہ پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ ایسے سیاہ فام غلاموں کی کل تعداد کیا ہو سکتی ہے جنہیں درآمد کر کے ہندوستان لایا گیا۔ اس کے مطابق مسلم خطوں میں غلاموں کی ہسپانیہ درآمد اور پھر ہندوستان کو روانگی ہر صورت میں ایک غیر مختتم ہجرت تھی جن کی تعداد بارہ صدیوں میں ان سے بھی زیادہ تھی جنہیں افریقہ سے بڑی تعداد میں نئی دنیا (شمالی امریکہ) کی جانب افراتفری والی ہجرت میں جانا پڑا۔ (23)۔ سیاہ فام آبادی کی بہت بڑی تعداد میں نہ ہونے کا سبب شرح اموات میں زیادتی کو کہا جا سکتا ہے، جس میں دیگر نسلوں کے لوگوں میں انجذاب اور یہ حقیقت کہ بہت سے نرینہ غلاموں کو خصی کر دیا جاتا تھا۔ ہندوستان کے وسطی علاقوں اور مغربی سواحل پر سیاہ فاموں کی متعدد برادریاں موجود ہیں جو افریقی غلاموں کی اولاد ہیں۔ مغربی ساحل کے چند جزائر پر بھی سیاہ فام غلاموں کی آل اولاد رہتی ہے۔ جنجیر جزائر جو تلفظ کے بگڑ جانے سے کہلاتے ہیں کیونکہ مرہٹے لفظ جزیرہ کہنے سے قاصر ہیں جس کے معنی جزیرہ ہے۔ یا پھر زنزیرہ جس کے معنی زنج یا سیاہ فام کی جمع یہی ان کا ملجا بن گیا۔ اسے حبسن بھی کہا جاتا ہے۔ یا افریقوں اور حبشیوں کی سرزمین، سترہویں صدی میں ان جزائر کے باسی سیدی یا زنجیرہ کہلاتے مغلوں کے امرا البحر کی حیثیت میں مرہٹوں سے ایک عرصے تک جنگ کرتے رہے۔

مختصراً مگر جذبات سے قطع نظر غیر ملکی امرا ترکوں، عربوں، مغلوں اور ایرانیوں پر مشتمل ہوتے۔ دیگر ہندوستانی (ہندوستان میں پیدا ہونے والے) دکنی، سیاہ فام یا مولدّ (افریقی باپوں اور ہندی عورتوں کے بچے)۔ چند حوالوں سے غیر ملکی مسلموں کا سیاہ فاموں کی تحقیر کرنا مصدقہ ہے کیونکہ ان کا ایسا ہی رویہ ہندوستان کے گیہواں رنگت رکھنے والوں سے تھا۔ کالے غلاموں کو کسی قسم کی تعلیم نہ ملتی یوں سیاہ فاموں کو احمق سمجھا جاتا۔ امیر خسرو نے ہندوؤں کو بھی اسی زمرے میں ڈال دیا۔ برنی کی تجویز تھی کہ ہندوستانیوں کو ابتدائی تعلیم سے زیادہ نہ دی جائے اس کے باوصف خانہ سازی مکمل نہ ہوئی تھی۔ ایسی مثالیں ملتی ہیں جن میں مربی کے لئے ممنویت ہے یا پھر ذاتی مفاد قربان کرنے پر تعجب نہ ہوتا مگر ایسے واقعات اکا دکا ہوتے۔ حب الوطنی کے مقابلے میں دھڑے بندی بالا دست تھی۔ اگر غیر ملکی ترک اور ایرانی خود کو برتر جانتے اور اعلیٰ مرتبوں پر اجارہ رکھتے تو کوئی سیاہ فام جون پور میں بادشاہت قائم کر لیتا اور ایک ہندو اسلام قبول کر لینے کے بعد گجرات میں موروثی حکمرانی قائم کر سکتا تھا۔ لیکن تمام امرا غیر ملکی ہوں یا ہندوستانی وہ اسلام کے مفاد کے حصول پر تلے رہتے، مہمیں اختیار کرتے اور قیدیوں کو پکڑتے رہتے۔ ان اسیروں کو ہر نوعیت کے سرکاری اور نجی کاموں میں جوت دیا جاتا۔

PDF created with pdfFactory trial version www.pdffactory.com

غلاموں کی ملازمت

قرون وسطیٰ میں مسلم حکومتیں غلاموں کو ہر شعبہ ہائے زندگی میں جوت دیتیں کسی بھی بڑے منصوبے کے لئے ہزاروں کی تعداد میں غلام درکار ہوتے، اس جدید تکنیکی عہد میں جن کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے چند مشینیں اور اوزار درکار ہوتے ہیں۔ اس زمانے میں غلام محنت کشوں کو کوئی قلت نہ تھی۔ ہندوستان میں مسلموں کی فتوحات سے بادشاہوں اور امرا کو بے شمار غلام مل جاتے۔ سرکاری امور سے لے کر گھریلو کام کاج کے لئے ہر کام کے لئے غلاموں کو رکھا جاتا۔

عمارتوں کی تعمیرات:

پہلی چیز جو دہلی کی مسلم سلطنت نے شروع کی وہ پر شکوہ عمارتوں کی تعمیر تھی۔ جس کا مقصد مقامی آبادی کو رعب و دبدبے میں لینا تھا جس سے اسلامی عہد کی عظمت اور سطوت کا اثر پڑے۔ اس کا حصول صرف اسی وقت ممکن ہوتا اگر رفیع الشان مسلم ایوان تعمیر کئے جاتے جس کے لئے دولت اور اشیائے تعمیرات جنگوں کے بعد ہندوؤں کی عمارتیں تباہ کر کے حاصل کی جاتیں۔ مسلم سیاسی قوت کے لئے تعمیرات کو بصری علامت سمجھا جاتا جس کے ذریعے ترک حملہ آور یہ چاہتے تھے کہ مفتوح رعیت کو رعب و دبدبے میں لیا جائے۔ اس سے مراد فتح اور اختیار رہوتا۔ جن علاقوں میں سے مسلم فاتحین کو افواج گزریں یا وسطی ایشیا یا ہندوستان پر حکمرانی کی وہاں انہوں نے نازک اور فلک بوس عمارتیں تعمیر کیں۔ اس سلسلے میں اہم نکتہ یہ ہے کہ عمارتوں کو تعمیر کرنے کے واسطے غلام ہی بھرتی کئے جاتے۔(1)

اور یوں ان ایوانوں (جن میں بہت سے آج بھی بطور یادگار موجود ہیں) کو تعمیر کرنے کے لئے ہزاروں غلاموں کو جوتا جاتا۔ اس طرح مختصر ترین وقت میں کام مکمل کر لیا جاتا۔ یہ بھی یقینی بات ہے کہ ان کاموں کی تکمیل کے واسطے ہزار ہا غلاموں کو ابتدائی فتوحات میں پکڑا جاتا جن سے جبراً کام لیا جاتا۔ وہ جامع مسجد جو دہلی میں ہے اس کا نام قصداً مسجد قوت اسلام رکھا گیا جس کی تعمیر کا آغاز ایبک (۵۹۲ھ/۱۱۹۵ء) نے اپنی فتح کے دو سال کے اندر کر دیا تھا۔(2)۔ اس کی تعمیر میں جو مال مسالہ اور سونا لگا وہ دہلی اور اس کے مضافات میں واقع ہندوؤں کے ۲۷ مندروں اور جین مت کے معبدوں کو مسمار کر کے حاصل کیا گیا تھا۔ مسجد میں نقش ایک فارسی تحریر سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔(3)۔ اجمیر کو قطب الدین ایبک نے فتح کرنے اور قبضے کے فوراً بعد جو مسجد تعمیر کرائی وہ احیاء دین کا جھونپڑا کہلاتی ہے۔ اس کی تعمیر میں بھی مسمار کئے جانے والے مندروں کا مال مسالہ لگایا گیا تھا۔ قطب مینار جس کا منصوبہ اور تعمیر کا آغاز ایبک نے کسی وقت ۱۱۹۹ء کے آگے پیچھے کیا تھا اور جسے التمش نے مکمل کرایا۔(4)۔ اس کی تعمیر میں بھی ایسا ہی سامان لگایا گیا۔ ''سنگتراشی والی شبیہیں جو پتھروں کی سلوں پر ہیں یا تو مسخ شدہ ہیں یا پھر انہیں الٹا کر دینے سے محوسی ہو گئی ہیں۔'' اس عاجلانہ فراہمی سے'' جیسا کہ حبیب اللہ نے درست نتیجہ نکالا کہ اس علامت میں پوری مملوک تاریخ سمٹ کر آ گئی ہے۔'' (بہ اصرار)۔(5)

قطب الدین ایبک اور التمش کو ان مساجد، مدرسوں، مزاروں، قصور اور حوضوں (مثلاً حوض شمسی) کی دہلی کے اندر اور باہر تعمیر مکمل کرانے کے لئے کتنے غلام درکار تھے؟ حساب لگانا تو دشوار ہے۔ مگر ان کی تعداد کے متعلق قیاس آرائی آسان ہے کیوں کہ ان سلطانوں نے بڑے پیمانے پر تعمیراتی سرگرمیوں کا آغاز کیا تھا۔ یہ بھی معلوم ہے کہ علاء الدین خلجی جو تعمیرات کا بڑا شوقین تھا اس نے زیر تعمیر عمارتوں پر ۷۰۰۰۰ کارکن غلام لگائے جس کی تصدیق ہم عصر وقایع نگار ضیاء الدین نے کی ہے۔(6)۔ علاء الدین نے ''مساجد میناروں، قلعوں اور حوضوں'' کو تعمیر کرایا۔ لیکن اس کا قطب مینارا کیلا ہی ایک ایسا بلند مرتبہ ایوان تھا جو اس کی دیگر تعمیرات سے بڑھ کر تھا۔ یوں پہلے دو سلطانوں کی عمارتوں پر کام کرنے والے افراد کی تعداد غالباً ان کارکنوں سے کم نہ تھی جنہیں علاء الدین نے لگایا تھا۔ عین ممکن ہے وہ زیادہ ہی رہے ہوں۔ ان غلاموں کو پہلے تو مندروں کو مسمار کرنا پڑتا اور وہ بھی بڑی احتیاط سے ایک ایک اینٹ کر کے خمیدہ ستون، ساق ستونوں اور میناروں کو تعمیرات کی نئی جگہوں پر پہنچانا اور وہاں ان کی تنصیبات۔ اگرچہ حسن نظامی کا کہنا ہے ان مندروں کو ہاتھیوں کی مدد سے ڈھایا گیا اور ایک ہاتھی اتنے پتھر ڈھو سکتا تھا جن کے لئے ۵۰۰ افراد کی ضرورت ہوتی۔(7)۔ لیکن یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ ان دنوں بہت سی مشینی کلیں دستیاب نہیں تھیں۔ زیادہ تر کام انسانی ہاتھوں اور اعضاء سے کئے جاتے۔ کام نازک تھا اور اس لئے غلاموں کو اکثر و بیشتر اس لئے کوڑے لگائے جاتے کہ یہاں سے وہاں لے جائی جانے والی پتھر کی سلوں کو نقصان پہنچ جاتا۔ بغ فی آغ نے جس کوڑے کا ذکر کیا ہے وہ کوئی شاہجانی عہد کی ایجاد نہیں تھا یہ تو تمام مسلم فتوحات اور زمانہ حکمرانی میں موجود تھا۔

ہندوراج اور میر عمارت، ماہر تعمیرات تھے۔ انہوں نے تعمیرات کے حیران کن نمونے وضع کئے۔ ہندستان کے مندروں کے متعلق البیرونی کا کہنا ہے کہ میرے لوگ'' تو ان کا حال بیان کرنے سے قاصر ہیں ایسی عمارت بنانا تو بڑی دور کی بات ہے'' ہندوستان میں تعمیرات کرنے والوں کو کبھی اچھا نہ لگا ہوگا کہ اپنی ہی تعمیر کردہ اعلیٰ تخلیقات کو اور اپنے مقدس مندروں کو اس لئے گرائیں تا کہ ان کے بجائے غیر ملکی حملہ آوروں اور حکمرانوں کے لئے مساجد اور میناروں کو تعمیر کریں۔ جملہ ترک غلام جو باہر سے آئے تھے وہ ہندوستان پہنچ کر بادشاہ، امیر، فوجی افسران اور یہاں تک کہ سپاہی بن گئے اور مقامی کارکنوں پر حکم چلانے لگے جو گردش زمانہ سے غلامی کر رہے تھے۔ مزید براں ہندوراج

PDF created with pdfFactory trial version www.pdffactory.com

ہے کہ علاء الدین کے عہد میں کوئی آستانہ ۲ یا ۳ دنوں میں تعمیر ہوسکتا ہے اور کوئی قلعہ دو ہفتوں کے اندر۔(8)۔

ان دنوں نئے نئے تخت نشین ہونے والے بادشاہ کے لئے یہ امر باعث افتخار سمجھا جاتا تھا کہ وہ اپنے لئے ایک نیا شہر تعمیر کرائے جس سے اس کا نام ہو اور اس کی حکومت اور موروثی سلطنت کی شہرت ہو۔ التمش کے پرانے شہر کو بلبن نے خالی کر دیا اور اپنا قصر لال تعمیر کرایا اور کیقباد نے شہر کلوغری تعمیر کرایا'' یہ ان کی روایت ہے'' ابن بطوطہ نے لکھا'' کہ بادشاہ کا محل اس کی موت پر ویران ہو جاتا ہے۔۔۔اور اس کا جانشین اپنے واسطے ایک نیا محل تیار کراتا ہے۔'' غلاموں کو اکثر دگنا کام کرنا پڑتا، ہندو عمارتوں کو مسمار کرنا اور اسی ملبے سے نئی عمارت تعمیر کرنا۔ اس زمانے میں لوگ حفاظتی نقطہ نظر سے گنجان علاقوں میں رہتے تھے۔ کوئی بھی شہر چند برس میں اس لئے ناقابل رہائش ہو جاتا کیونکہ کوڑا کرکٹ اور غلاظت کو ٹھکانے لگانے کے ذرائع کی کمی ہو جاتی۔ ابن بطوطہ اور بابر نے توثیق کی ہے کہ ان سب کو رطوبت کی زیادتی کی وجہ سے مسمار کیا گیا۔ یہ بھی ایک وجہ تھی کہ یہ مناسب سمجھا جاتا کہ کوئی نیا قصبہ بنا کر وہاں اٹھ جایا جائے جہاں پر ہر چیز صاف ستھری ہو۔ پرانے شہروں کو ہندو بھنگی اور خاکروب صاف رکھنے کے لئے محنت کرتے۔ اور نئے شہروں کو تخلیق کرنے کے واسطے بھی خون پسینا ایک کرتے۔

نئے شہر بنانے میں محمد تغلق اور فیروز تغلق بھی اتنی ہی دلچسپی رکھتے تھے جتنی التمش اور علاء الدین خلجی کو تھی ساتھ ہی ساتھ نئی عمارتیں بنانے اور سابقہ مسلم حکمرانوں کے قدیم ایوانوں کی مرمت بھی کراتے۔ شمس سراج عفیف فیروز کے راج مزدوروں کو فیروز تغلق کے ۱۸۰۰۰۰ (یا پھر دو لاکھ) غلاموں میں ہی شمار کرتا ہے۔(11)۔ لیکن مختلف کاموں کے لئے الگ الگ تعداد سے یہ واضح ہوتا ہے کہ وہاں راج اور دیگر تعمیراتی کارکنوں میں ۱۲۰۰۰ ایسے غلام بھی تھے جو صرف سنگتراشی کرتے تھے۔ یہاں تک کہ اشوک کے میناروں کی دہلی منتقلی کے لئے چند ہزار آدمی درکار رہتے تھے۔ اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ہے کہ حملہ آور تیمور (۱۳۹۹ء) کو ہندوستان میں نفیس مسلم عمارتیں ملیں، اس نے ہزاروں کاریگروں اور تعمیرات کے کارکنوں کو غلام بنایا جن میں سے بہت سوں کو وہ اپنے ہمراہ سمرقند لے گیا ایسی ہی خوش ذوقی والی عمارتیں تعمیر کرانے جیسی فیروز شاہ نے جامع مسجد بنوائی تھی اور ایبک نے قطب مینار۔(12)۔ لیکن ہندوستان سے اس کی واپسی کے ساتھ جلد ہی ان غلاموں کی جگہ نئے لوگوں نے لے لی۔ اور ہر سلطان اور امیر نئی تعمیرات مکمل کرانے میں حسب معمول جت گیا۔

سلطنت کے علاوہ پوری پندرہویں صدی میں ہندوستان بھر میں نئی مسلم ریاستیں ظہور میں آتی رہیں۔ ان سب میں تعمیراتی سرگرمیوں کی ایک ہوڑ لگی ہوئی تھی جن میں مقامی غلاموں سے مدد لی جاتی۔ مرکز میں سکندر لودھی کو حق ملنا چاہیے کہ اس نے قریب قریب ہر اہم شہر میں مساجد بنوائیں جن میں لاہور، کرنال، ہانسی، مکن پور (ضلع کانپور) اس کے علاوہ دلی اور آگرہ میں۔(13)۔ لودھی باغ دلی کے مقبروں کے علاوہ ہمیں بہت سے گمنام مقبرے لودھی عہد کے ملتے ہیں۔ سکندر لودھی کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ اپنے پیشرو فیروز تغلق کی طرح اس نے بھی ایک نہر کھدوائی (۱۴۹۲ء-۱۴۹۳ء)(14)۔ اور راجستھان میں ایک باولی ''متھرا میں اور دیگر جگہوں پر'' مثلاً الہ آباد اور بنارس میں اس نے مندروں کو مسجد میں بدل دیا اور متعدد مسلم سرائے قائم کیں، کالج قائم کئے اور بازار تک ہندو عبادت گاہوں میں بنوا ڈالے۔(15)۔ فیروز تغلق کی طرح سکندر لودھی بھی قدیم مسلم یادگاروں کا بڑا مرمت کرانے اور دیکھ بھال کرنے والا سمجھا جاتا ہے۔ قطب مینار کی راہداری کے در پر ایک عبارت نقش ہے جو بتاتی ہے کہ اس یادگار کی مرمت کا سہرا بھی اس ہی کے سر بندھا ہے۔(۱۵۰۳ء/۹۰۹ھ)(16)۔

ہم نے ابھی تک دہلی کے تعمیراتی کاموں کے متعلق گفتگو کی ہے مثلاً ایبک، التمش، علاء الدین خلجی، فیروز تغلق اور سکندر لودھی۔ اور یہ کہا ہے کہ ان کی تعمیرات کے واسطے ہزاروں غلاموں کی ضرورت تھی۔ اس بات کا اعادہ غیر ضروری لگتا ہے کہ عام مسلم حکمران تعمیرات کے بڑے شوقین تھے اور ان غلاموں کی تعداد جنہیں شہروں، مسجدوں، سرایوں اور ہر سلطان اور امیر اور صوفی شیوخ کے مقبروں کی تعمیر کے لئے دہلی اور سلطنت کے دوسرے شہروں میں رکھا جاتا تا ان کی تعداد ہزاروں میں ہو گی۔ اور جب دہلی کی سلطنت پارہ پارہ ہوئی تو صوبوں اور خود مختار بادشاہوں میں واقع عمارتوں میں بھی یہی صورتحال ہوئی۔

''ہمیں ایک فنکارانہ مالا کا احساس ہوتا ہے جو ہندوستان کے حکمران مغل گھرانے میں پیڑھی در پیڑھی دیکھنے میں آئی''۔ یہ بات ۱۹۳۲ء میں ای۔ مکلا گان نے لکھی۔ اس فنکارانہ احساس نے ان کی تعمیرات میں جلوہ گری کی۔ اور وہ جنہوں نے یہ تعمیرات کرائیں ان کے پاس دونوں چیزیں یعنی بے تحاشہ دولت اور غلاموں کی کثرت تھی۔ بابر لکھتا ہے کہ'' آگرہ میں میری عمارتوں پر ۶۸۰ افراد کام کرتے تھے۔۔۔صرف۔ جب کہ میری آگرہ، سیکری، بیانہ، دولپور (دھولپور) گوالیار اور کول (علیگڑھ) میں ۱۴۹۱ سنگتراش مصروف کار رہتے۔ اسی طرح لاتعداد دستکار اور ہر قسم کے کارکن ہندوستان میں موجود تھے۔(17)ان میں سے چند ایک اجرت پر کام کرنے والے تھے جیسا کہ اس نے کہیں اور لکھا ہے۔ آگرہ کے سنگتراشوں کو تحفے تحائف دیے جاتے اور مزدوروں کو اور تمام ارکان کو بھی جو آگرہ کے ہنرمندوں اور اجرت پر کام کرنے والوں کے لئے دستور تھا۔ لیکن جیسا کہ کہیں اور کہا جا چکا ہے کہ غلاموں کو اجرت پر کام کرنے والوں اور ملازموں پر ترجیح دی جاتی۔ اور کوڑا ہنرمندوں، دستکاروں، ملازمین اور غلاموں کو نظم و ضبط میں رکھتا۔ بابر کے عہد سے لے کر شاہجہاں کے دنوں تک جس کے'' بابرکت عہد میں جب۔۔۔ حسین ایشیاء نے جامعیت کا عروج حاصل کر لیا۔'' کروڑوں میں رقم اور ہزار ہا غلام سینکڑوں بڑی بڑی مغل عمارتوں کو پایہ تکمیل تک پہنچاتے جو آج بھی موجود ہیں۔(19)۔

بادشاہوں کی حیثیت کو اس کے ممتاز امراء ہوبہو نقل کرتے امیرانہ ٹھاٹھ باٹھ رکھنے والے صوبائی امراء یا اپنے لئے اعزاز سمجھتے اور لازم بھی کہ اپنے دائرہ کار کے قصبوں اور شہروں کی عالیشان عمارتیں جگمگائیں۔ موت کی صورت میں پورا تر کہ بادشاہ کو مل جانے کے قانون کے سبب وہ بے دردی سے خرچ کرتے۔ پیلسیارٹ کا اس مسئلہ پر قول شاید حرف آخر ہے۔''میں نے اکثر بڑے افراد سے پوچھنے کی جرأت کی'' ان کا کہنا ہے۔'' آپ کا حقیقی مقصد کیا ہے اور آپ ان خزانوں کو جمع کر لینے کے لیے کیوں اتنا بے تاب ہیں، جب کہ آپ نے جو جمع کیا ہے وہ آپ کے کسی کام کا نہیں ہے اور نہ ہی آپ کے خاندان کے واسطے (خصوصاً مذکورہ بالا قانون کی موجودگی میں)۔۔۔ میں نے ان سے التماس کی کہ انہیں چاہیے کہ وہ اس دولت میں غریبوں کو شریک کر لیں جو اس ملک میں لاکھوں کی تعداد میں ہیں یا پھر کہئے کہ لاتعداد (جن میں بلاشبہ غلام بھی شامل ہیں)۔۔۔ان کے جواب قطعاً دنیاوی خود نمائی پر منحصر تھے۔۔۔ عمارتیں جو انہوں نے جس عظیم ذوق و شوق سے تعمیر کرائیں۔ باغات، مقبرے، محلات۔'' جنہیں انہوں نے

PDF created with pdfFactory trial version www.pdffactory.com

مستحکم کر کے اپنے باپ دادا کا نام روشن کر دے۔ اگر ان ایوانوں کی دیکھ بھال ہوتی اور مرمت ہوتی رہتی تو ہر شہر کے قطعات اور گاؤں سجے ہوئے ملتے۔ (21)۔ ایوانوں سے۔ لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ جو سڑکیں شہروں کو جاتی ہیں ان پر جگہ جگہ پتھروں کی سلیں پڑی ہوئی ہیں۔'' (22)

مختصراً ترک اور مغل سلاطین اور امرا یہ سوچے بغیر شگوفہ بننے کی دھن میں پڑے رہے اور ان ایوانوں کی حفاظت کا انہیں کوئی خیال نہ آیا۔ ان کے تخلیقی جذبات کا سارا بوجھ ان بے زبان غلاموں نے اپنے خون اور پسینے کی صورت میں اٹھایا۔ (23)

فوج میں:

ایک اور شعبہ جس نے غلاموں کی ایک بڑی تعداد کو کھپایا ایسا مسلم حکمرانی کے آغاز سے ہوا وہ تھی فوج۔ بغیر کسی طاقتور فوج کے کوئی فتح یابی ممکن نہ تھی اور ہندوستان میں مسلم حکمرانی بھی نہ ہوتی۔ ضیاء الدین برنی برملا کہتا ہے کہ ''بادشاہت تو فوج سے ہے اور فوج بادشاہت سے'' (24)۔ مراد یہ ہے کہ ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم۔ ہندوستان مین مسلم حکمرانی میں توسیع فتوحات کے بغیر ممکن نہ تھی اور اسی طرح سلطنت اس لئے یہ فطری تقاضہ تھا کہ ایک بڑی فوج رکھی جائے۔

ایسے سپاہی جو مستقل ملازمت رکھتے اور یا پھر بادشاہ کی جان کے محافظ ہوتے وہ جاندار کہلاتے جنہیں اس کے ذاتی غلاموں، غلمان اور ممالک میں سے لیا جاتا۔ (25)۔ غیر ملکی غلاموں کو ہر ملک اور قوموں سے خریدا جاتا۔ ان میں ترک، ایرانی، خلجی، سلجوقی اُغس (عراقی ترکمان بھی کہلاتے) افغانی وغیرہ بھی غوریوں اور غزنیوں کی فوج میں ہوتے۔ ''نئی مفتوحات پر تسلط برقرار رکھنے کی غرض سے متصل علاقوں کے نوعمر غلاموں کو درآمد کیا جاتا اور انہیں اپنے آقاؤں کے دربار میں تربیت دی جاتی یوں وہ جنگجو اور انتظامی امتیاز پا جاتے اور محض ان کے وفادار بن جاتے اس طرح فوجی رفیق بھی ہوتے۔ (26)۔ ہر ہتھکنڈے اور خطے سے غلاموں کو حاصل کرنے کی روایت کو دہلی کے سلاطین نے جاری رکھا۔

ان غیر ملکی غلاموں کو پکارنے اور اختصار کی غرض سے ہم ان کے لئے عمومی اصطلاح ترک اور افغان استعمال کرتے ہیں۔ محمد غوری اپنی آخری مہم میں اپنے ہمراہ دس ہزار گھڑ سوار لایا۔ (27)۔ التمش کے عہد میں جلال الدین منگبارنی خوارزمی جس کے تعاقب میں چنگیز خان تھا، اپنے ساتھ افغان فوج کے بہت سے دستے لایا تھا۔ وقت گزارنے کے بعد ان میں سے بہت سوں نے التمش کی ملازمت اختیار کر لی۔ (28)۔ بلبن نے میواتیوں کے خلاف اپنی مہموں میں تین ہزار پیادہ اور گھڑ سوار افغان استعمال کئے۔ (29)۔ اور دیگر ہزاروں کو دشوار علاقوں کے قلعوں کے پڑاؤ میں رکھا مثلاً گوپال گیر، کامپل، بھوج پور، پٹیالی اور جلالی۔ (30)۔ اس کے شاہی جلوس میں سینکڑوں سیستان غوری، سمرقندی اور عرب سپاہ اپنی تلواروں کے ساتھ بلبن کے کوچ میں ہمرکاب رہا کرتے۔ افغانوں کی مانند منگول (میں پھر نسلیات کی عمومی اصطلاح) بھی غلام بنائے جاتے یا انہیں ترغیب دی جاتی کہ وہ خلجیوں کی فوج میں شامل ہو جائیں۔ وہ علاء الدین خلجی کے زمانے میں نومسلم کہلاتے۔ افسران کے عہدوں اور عام ملازموں میں ایرانی عنصر پایا جاتا تھا۔ خرید کردہ ابی سینیا کے غلام اور افسران رضیہ کے زمانے میں ممتاز ہوئے۔ فیروز شاہ تغلق کے آتے آتے ہندنژاد غلاموں نے دساوری غلاموں کی جگہ لینا شروع کر دی۔ ایک مثال یہ ہے کہ ''جب سلطان شاہانہ کروفر سے نکلتا تو غلاموں کے پرے اس کے ہمراہ ہوتے وہ بھی ممتاز اور خصوصی دستے کی صورت میں۔'' پہلے تیرانداز پوری طرح مسلح اس کے بعد شمشیر زن تعداد میں ہزاروں (ہزار، ہزار) پھر لڑنے والے (بندگان آورد) ان کے پیچھے بندگان ماہلی جو زرہ بھینسوں پر سوار ہوتے اور ہزارہ کے غلام جو عرب اور ترک گھوڑوں پر سوار ہوتے اور ہاتھ میں پرچم اور کلہاڑیاں لئے ہوتے۔ یہ سب ہزار ہا شاہی خدم وحشم کا حصہ ہوتے۔ کوئی ۴۰۰۰۰ تو ایسے تھے جو بطور اس کے محافظ کے روزانہ اور ہمہ وقت کمر بستہ رہتے (32)۔ سید برادران اور لودھی حکمرانوں کے تحت ہمہ اقسام کے افغان قبائل اور گوتیں ہندوستان میں بالکل چیونٹیوں اور ٹڈی دل کی طرح جمع ہو گئیں۔ (33)۔

ہندوستانی غلام بطور تحفہ بھی حاصل کئے جاتے اور ماتحت ریاستوں سے بہ طور باج بھی یا پھر مہموں میں غلام بنایا جاتا۔ ایک مرتبہ ٹوٹ جانے اور وفاداری کی خو پیدا ہو جانے اور ملازمت کر لینے کے بعد انہیں بہ آسانی فوج میں بھرتی کر لیا جاتا۔ بیشتر ہندوؤں کا تعلق تو پیدل دستوں سے ہوتا اور پایک کہلاتے۔ ان میں سے کچھ لوگ غریب ہوتے جنہوں نے فوج میں شرکت ملازمت حاصل کرنے کے لئے کی تھی دیگر غلام تھے اور جنگوں میں بنائے جانے والے اسیر تھے۔ جنگوں میں کم سن لڑکے اسیری کے لئے ترجیح دیئے جاتے اور انہیں قیدی بنانا بھی آسان تھا۔ مثلاً اپنی کیٹھر کی مہم میں بلبن نے بے رحمی سے قتل عام کیا لیکن آٹھ سے نو سال کے لڑکوں کو چھوڑ دیا۔ (34)۔ عمر کا عنصر معنی خیز ہے۔ کیونکہ جب یہ لڑکے بڑے ہوئے تو انہیں اپنی ولدیت اور وطن مالوف بہ مشکل یاد رہتا اور وہ صرف اپنے آقا کے ہی وفادار رہتے۔ دیگر معاملات میں بھی صورت حال ایسی ہی ہوتی۔ غلام کی حیثیت بالعموم جنگی قیدی جیسی ہوتی۔ اور اسلامی رواج کے مطابق اس کی زندگی صیاد کے رحم وکرم پر رہتی۔ یوں جب کوئی فاتح یا حملہ آور یہ مناسب سمجھتا کہ کسی غلام کی زندگی بخش دی جائے اور اسے اپنی ملازمت میں لے لے۔ یہ ایک خصوصی کار خیر ہوتا جس کے لئے غلام اپنے کو ممنوں سمجھتا۔ (35)۔ بہت سے پایکوں کو کھلی منڈی میں سے خریدا جاتا۔ شہزادہ علاء الدین خلجی نے کڑہ کے گورنر کی حیثیت میں ان محاصل سے ۲۰۰۰ پایک خریدے جنہیں اسے دہلی بھیجنا چاہئے تھا مگران دستوں کے ساتھ اس نے (۱۲۹۶ء) میں دیوناگری پر فوج کشی کر دی۔ (36)۔

پایکوں کو متفرق فرائض سونپے جاتے تاکہ انہیں وہ انجام دیں۔ وہ گھڑ سواروں کے رسالے کے گھوڑوں کو کھلاتے پلاتے اور انہیں تربیت دیتے کیونکہ اول الذکران سے برتر حیثیت رکھتے تھے۔ علاء الدین خلجی کے پاس دیگر عہدیداروں کے علاوہ ۵۰۰۰۰ گھڑ سواروں کا رسالہ تھا۔ (37)۔ ہزاروں غلام تو اس لئے درکار تھے جو ان کی دیکھ بھال کریں۔ یہی معاملہ ہاتھیوں کے اصطبل کا تھا ان فیل خانوں میں ہزاروں ہاتھی، مہاوت، غلام اور پایک اس لئے نوکری پر حاضر رہتے تاکہ جانوروں کو خوراک پہنچائی جائے۔ اور نشوونما کی جائے۔ (38)۔ غلاموں کی تعداد جو ان جانوروں کی نگہداشت پر مامور تھے ان کے متعلق محض اندازہ ہی لگایا جا سکتا ہے۔ (39)

ایک مہم کے دوران میں غلاموں نے جنگل صاف کر کے فوج کی کوچ کے واسطے سڑک تیار کر دی، راہ میں متعدد ٹاپو بھی تھے اور منزل پر پہنچنے تک غلام اور پایک کیمپ

PDF created with pdfFactory trial version www.pdffactory.com

میٹر)۔(40)۔وہ گڑگچ اور ثبات تیار کرتے۔گڑگچ ایک سایہ دار چبوترہ ہوتا جس میں پہیے لگے ہوتے تا کہ بہ حفاظت قلعے کی کرسی تک پہنچ سکیں۔ثبات ایسے بلند و بالا چبوترے ہوتے جن سے کسی قلعہ کی دیوار پھلانگ کر حملہ کرنے کے لئے مدد لی جاتی۔جنگی نقاروں اور پرچموں کو سامان ڈھونے والے غلاموں کے خیموں کے سامنے رکھا جاتا جن کی گھڑ سوار سپاہ گشت لگا کر پہرہ دیتے۔(41)

پایکوں کو ایسے مقاموں پر ٹھہرایا جاتا تا کہ دشمن کے حملے کی صورت میں پہلا وار وہی جھیلیں لیکن وہ اپنی جگہ نہیں چھوڑ سکتے تھے کیونکہ ان کے ''دائیں اور بائیں جانب گھوڑے ہوتے۔۔۔اور (ان کے) پیچھے ہاتھی تا کہ ان میں سے کوئی فرار نہ ہونے پائے۔''(42)۔لیکن پایک بھی بڑے لڑاکے تھے۔کیونکہ علاءالدین خلجی کی (۱۲۹۶ء) دیوناگری پر حملہ کرنے والی فوج میں ۲۰۰۰ پایک بھی تھے۔بیشتر فارسی کے وقایع نگاروں نے پایکوں کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ اچھے سپاہی ہیں اور ہندوستان کی مسلم فوج کے زور بازو۔دوارٹ بار بار وسا جو ہندوستان میں پرتگال کا سرکاری اہلکار تھا (۱۵۱۸ء) میں لکھتے ہوئے ان کے متعلق کہتا ہے ''وہ تلواروں اور خنجروں، تیروں اور کمانوں سے مسلح ہوتے ہیں۔وہ اچھے تیر انداز ہوتے ہیں، ان کی کمانیں لمبی اور برطانیہ والوں کی طرح کی ہوتی ہیں۔۔۔ان میں زیادہ تر ہندو ہیں''(43)''ان کا سب سے اہم ہتھیار دھنک یا دھنش ہے(44) خلجی کے عہد میں (۱۲۹۰ء۔۱۳۲۰ء) پایک عنصر علاءالدین کی فوج میں ممتاز ہو گیا تھا کیونکہ اس نے ترک غلام امراء سے اقتدار چھین لیا تھا اور وہ ترک سپاہ پر کلی انحصار نہیں کرنا چاہتا تھا۔جب سلطان علاءالدین منگول حملہ آور قتلغ خاں سے لوہا لینے والا تھا تو دہلی کے کوتوال ملک علاءالملک نے یہ کوشش کی کہ اسے کسی عاجلانہ اقدام سے باز رکھا جائے اور اس کے مختلف دلائل میں سے ایک یہ تھا کہ ''ہماری فوج کا بڑا حصہ ہندوستانی سپاہ کا ہے۔(45)۔ان کی موجودگی عالم اور مورخ ضیاءالدین برنی کو ناپسند تھی جسے فوج میں غیر مسلموں کی بھرتی ناپسند تھی۔(46)۔بلاشبہ ہندوؤں میں کبھی کبھی ایسے اعلیٰ مرتبہ افسر بھی ہوتے جیسے ملک نایک۔امیر خسرو کے بیان کے مطابق یہ ملک نایک ہی تھا جس کی سربراہی میں (آخور بیگ میسرہ: فوج کے بائیں بازو کا شہسوار حاکم) جو ایک ہندو بندہ، تھا کو تیس ہزار گھڑ سواروں کو منگولوں علی بیگ، ترتاق اور تارغی کے خلاف روانہ کیا گیا۔(47)۔علاءالدین کا نامور سپہ سالار ملک کافور، ہزار دیناری تھا۔آنے والے دنوں میں ہمیں ایسے ناموں بہادر نہر، سارنگ خان، شیخا کھوکھر اور ملو خان تھے غالباً جو سب ہی ہندو مذہب چھوڑ کر جنگجو بنے تھے۔

ایسے ماحول میں جہاں ہر طرف سازش، شک اور فریب کا دور دورہ ہو جہاں بادشاہوں کا تختہ الٹا جاتا ہو موروثی حکومتوں کے ترک غلام یا غلاموں سے امیر بن جانے والے لوگ حکومت کا دھڑن تختہ کر دیتے ہوں وہیں پایکوں کو وفاداری اور جاں نثاری کی وجہ سے پہچانا جاتا تھا۔چاہے وہ جنگی قیدی بنتے وقت کم سن لڑکے ہوں یا جوان سپاہی یا براہ راست فوج میں بھرتی کئے گئے ہوں۔پایک ہر حال میں اپنے آقاؤں کے زیادہ تر وفادار رہے۔اس وفاداری کی اساس آدمی کی آدمی سے وابستگی ہوتی۔اول سردار کا اسیر سے یہ رشتہ جس کی جان بخش دی جاتی اور اگر جنگجو آقا فتوحات میں کامیاب ہو کر اپنی حکومت قائم کر لیتا تو حاکم اعلیٰ کی تابع آسامی بن کر۔ہندو روایات کی ایک بنیادی حقیقت تو نمک کھا کر وفادار رہنا ہے۔ہمیں کئی مثالیں ملتی ہیں۔جن میں پایک عین وقت پر اپنے آقاؤں کی جان بچانے آئے جب ان کی جانوں پر خطرہ منڈلا رہا تھا۔مثلاً جب سلطان علاءالدین رنتھنبور پر (۱۳۰۱ء) میں فوج کشی کرنے جا رہا تھا اس نے تلپت میں چند دنوں کے لئے قیام کیا اس دوران میں سلیمان نے جو اکت خان کہلاتا تھا نے یہ منصوبہ بنایا کہ اسے قتل کر دے۔اکت خان نے سوچا کہ جس طرح علاءالدین کو اپنے چچا جلال الدین کو قتل کر لینے سے تخت ملا ہے اسی طرح وہ اپنے چچا علاءالدین کو قتل کر کے تخت نشین ہو سکتا ہے۔اسی لئے اس نے بادشاہ پر حملہ کر دیا۔لیکن آخر الذکر کے وفادار پایکوں نے اسے چاروں جانب سے گھیر لیا اور اپنی مقامی چلتر سے کام لے کر ایسی آہ و بکا شروع کر دی جیسے سلطان مر گیا ہو۔ناتجربہ کار اور احمق اکت خان جزواً اس لئے کہ وہ سلطان پر ہاتھ نہ ڈال سکا تھا اور دوسری وجہ یہ کہ اسے تخت پر قبضہ کرنے کی جلدی تھی۔بلا تامل پایکوں کے خوشگوار واویلے پر یقین کر بیٹھا اور شاہی خیموں کی جانب برق رفتاری سے چل پڑا اور علاءالدین کے تخت پر براجمان ہو گیا۔دریں اثنا علاءالدین کے ذاتی محافظوں نے اس کے زخموں کی مرہم پٹی کر دی اور اسے ہوش آ گیا۔وہ اپنے خیمے کی جانب برق رفتاری سے جا پہنچا اور کسی بلند مقام پر کھڑا ہو گیا تا کہ لوگ دیکھ سکیں۔اور اکت خان کا سر قلم کر دیا گیا۔

علاءالدین کی موت کے بعد اس کا پسندیدہ غلام جو جنرل اور وزیر بھی تھا اس نے چاہا کہ ساری طاقت اپنے ہاتھوں میں سمیٹ لے اور اس مقصد کے لئے اس نے یکے بعد دیگرے تمام شہزادوں کو قتل کرانا شروع کر دیا۔اس نے چار پایکوں بنام مبشر، بشیر، صالح اور منیر کو سلطان کے بیٹے مبارک خان کو اندھا کرنے کی غرض سے روانہ کیا۔لیکن جب ان پایکوں نے قید خانے میں بند شہزادہ سے رابطہ کیا تو مبارک نے انہیں ان کی وفاداری یاد کرا دی اور ان فرائض کی جو ان پر متوفی بادشاہ کے بیٹوں کے لئے واجب تھیں۔۔۔مبارک کے احساس دلانے پر انہوں نے صرف نہ اسے چھوا بلکہ ملک کافور کو بھی قتل کر ڈالا یوں مبارک خان کی تخت نشین کی راہ ہموار کر دی۔(49)۔اسی طرح رائے بھیروں بھٹی جو فیروز شاہ تغلق کا ذاتی ملازم تھا اس نے اس وقت اس کی جان بچائی جب اس کے عزیز و اقربا نے سلطان کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا۔(50)۔لیکن ایسے رویوں کا کوئی سکہ بند طریقہ نہ تھا۔بادشاہ تو ظل سبحانی ہوتا اور اگر پایک کسی امیر کے لیے خصوصی وفاداری پیدا کر لیتے جو سلطان سے مخاصمت رکھتا تو وہ بادشاہ کو بھی قتل کر سکتا تھا۔اسی وجہ سے سرور الملک جو سلطان مبارک شاہ سید (۱۴۲۱ء۔۱۴۳۴ء) کا وزیر تھا اس نے پایکوں کے ایک دھڑے کے ذریعے مبارک کو قتل کرا دیا۔(51)۔جب کہ دوسری جانب ہندو افسران کی وفاداری ضرب المثل بن گئی۔

مختصراً ہندوستانی غلاموں نے مسلم افواج میں ہمہ اقسام کے فرائض انجام دیے۔وہ گھڑ سواروں کے نوکروں کی خدمات انجام دیتے۔وہ مہموں کے دوران میں جنگلات کو صاف کرتے اور سڑکیں تیار کرتے۔ہتھیار ڈھالتے جنگوں میں آقا کے لئے لڑتے۔پھر بھی انہیں ہمیشہ اس کی یاد دہانی کرائی جاتی رہی کہ جہاں تک حق خدمت کا تعلق ہے ان کی حیثیت ادنی ہے۔جس کا تعین قانون شریعت کے مطابق ہوتا۔مال غنیمت جو جنگ میں ہاتھ آتا ریاست کا حق خمس ہوتا جب کہ پانچ میں چوتھا حصہ (۸۰%) لڑاکا دستوں کا چلا جاتا لیکن پیادہ کے مقابلے میں گھڑ سوار کا حصہ دگنا ہوتا۔(52)۔بطور ذمی ہندو پایک کا مال غنیمت میں کوئی حصہ نہ ہوتا۔ذمی عورتیں اور بچے چونکہ جہاد میں لڑ نہیں سکتے اس لئے ان کا کوئی حق نہ تھا۔لیکن اس کے باوجود انہیں کچھ نہ کچھ دیا جاتا'' تا کہ جنگ میں شرکت کے واسطے ان کی ہمت افزائی ہو اور وہ کہیں

PDF created with pdfFactory trial version www.pdffactory.com

کارخانوں کی ملازمت:

غلاموں کی ایک بڑی تعداد اس لئے لائی جاتی تھی تاکہ وہ شاہی کارخانوں میں کام کریں۔ دہلی میں قائم کارخانے سلطانوں اور مغل شہنشاہوں کے لئے مصنوعات تیار کرنے والے کارخانے کے علاوہ ایسے گودام بھی ہوتے جہاں نفیس اشیاء تیار کی جاتیں اور کبھی کبھی بڑی مقدار میں اور ان درآمدات کو بھی رکھا جاتا جنہیں چین، عراق اور اسکندریہ تک سے منگایا جاتا اور وصول کر کے وہیں ذخیرہ کیا جاتا۔ شمس سراج عفیف ہمیں فیروز شاہ تغلق کے کارخانوں کے متعلق تفصیلی روداد دیتا ہے اگرچہ اس قسم کے کارخانے اس کے عہد سے پہلے اور بعد کے سلطانوں کے زمانے میں بھی موجود تھے۔ جے۔ ایچ۔ کریمر کے مطابق۔ ''مسلم ممالک میں صنعتی پیداوار ایک خاص اندز میں فروغ پاتی تھی۔ جس کی امتیازی صفت یہ تھی کہ اس کا پورا نظم ونسق حکمرانوں کے ہاتھ میں رہتا تھا۔۔۔ اور اپنی تنظیم میں کاری گروں کی انجمنوں کے پاس۔ مسلم امت کی خوشحالی کے زمانے میں یہ ممکن ہو چکا تھا کہ صنعتی ہنر کے فروغ پا جانے سے مصنوعات میں فنکارانہ قدر کا اضافہ اور لاثانی عروج حاصل کر لے۔ اس فہرست میں سب سے پہلے سوتی کپڑے کی صنعت کا ذکر ہونا چاہیے۔۔۔(54)

فیروز تغلق (۱۳۵۱ء۔۱۳۸۸ء) کے عہد میں سلطان کے براہ راست زیر انتظام چھتیس کارخانے تھے۔ ان کے اندر متعدد اشیاء تیار کی جاتیں اور سونے، چاندی، پیتل اور دیگر دھاتوں، پارچہ بافی کی مصنوعات، شرابیں، عطریات، زرہ بکتریں، ہتھیار، گھوڑوں اور اونٹوں کی کاٹھیاں اور ہاتھیوں کو اوڑھانے کے غلاف، چرمی اشیاء اور کپڑے رکھے جاتے۔ لیکن کارخانوں کی یہ ذمہ داری بھی تھی کہ وہ ''ہاتھیوں، گھوڑوں، اونٹوں کے اصطبلوں، مطبخ، امور باورچی خانہ موم بتیوں کا محکمہ، کتا گھروں، پانی سرد کرنے کا محکمہ اور دیگر تام جھام۔۔۔ توشہ خانہ، علم خانہ یا نشان، قالین خانہ اور الم غلم۔۔۔ محکمہ قالین پر کوئی دو لاکھ تنکہ صرف کیا جاتا اور علم خانے پر ۸۰۰۰۰۔۔۔ تنکے۔''(55)۔ ان میں سے ہر محکمہ کسی آزمودہ امیر یا پھر خان کو سونپا جاتا اور ہر کارخانے کے روزمرہ اور یکمشت اخراجات کو پورا کرنے کے لئے لاکھوں تنکے منظور کئے جاتے۔

یوں ایک قسم کی سرمایہ کاری کا وہاں وجود تھا اور انجمنیں تشکیل پا چکی تھیں جو تربیت یافتہ کساب (کاریگروں) ماہر ہنرمندوں اور دستکاروں پر مشتمل تھیں۔ فیروز تغلق کے کارخانوں میں ۱۲۰۰۰ غلاموں سے کام لیا جاتا جنہیں ان کی صلاحیتوں کی مناسبت سے ۱۰ تنکوں سے ۱۰۰ تنکوں تک تنخواہ دی جاتی۔ یہ غلام ایک قسم کی انجمن تھے اور لاجواب اشیا تیار کرتے۔ ''کوئی پیشہ ایسا نہ تھا جس میں فیروز شاہ (یا پھر اس مقابلے میں کوئی بھی (سلطان) کے غلاموں کو نہ رکھا گیا ہو۔'' نہ ہم یہ کر سکتے ہیں اور نہ ہی ہمیں ہر محکمے کی تفصیلات میں پڑنا چاہئے۔ یہاں پر ہم خود کو دو محکموں کی مختصر رودادوں تک محدود رکھیں گے جس میں ایک توشہ خانہ اور دوسرا اسلاح خانہ ہے۔ ان سے کارخانوں کے ادارے کے متعلق ہمیں اندازہ ہو جائے گا جو بہت بڑی تعداد میں غلاموں کو بھرتی کر لیتے تھے مگر جن میں شاہی غلاموں کی اکثریت نہ ہوتی۔

سوتی پارچہ جات اور ملبوسات

شہاب الدین العمری کے بقول ''ہر سال سلطان (محمد تغلق) ۲۰۰۰۰۰ خلعتیں تقسیم کرتا' ایک لاکھ موسم بہار میں اور ۱۰۰۰۰۰ اخزاں میں۔ ایسے ہی ملبوسات خانقاہوں اور درگاہوں میں بھی تقسیم کئے جاتے۔ سلطان ہمیشہ اپنے پاس زردوزی کے کاری گر رکھتا جو کمخواب پر طلا کاری کرتے جسے سلطان کی بیگمات پہنتیں اور اسے امیروں اور ان کی بیویوں کو بطور تحفہ تحائف دیا جاتا۔(56)۔ ابن بطوطہ محمد بن تغلق کے جن تحائف کی فہرست لے کر چین کے شہنشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا وہ بھی ہندستان میں سوتی کپڑے کی صنعتی ترقی سے ہمیں آگاہ کرتی ہے جس کے تمام کارکن غلام ہوتے تھے۔ ان تحائف میں ۱۰۰ پارچوں پر مشتمل ایسا سوتی کپڑا تھا جسے بیرامی کہا جاتا تھا۔ جو خوبصورتی میں لاثانی ہوتا اور ہر ٹکڑا قیمتاً ۱۰۰ دینار کا ہوتا۔ ریشمی کپڑے کے بنے ہوئے پارچہ کو جز کہا جاتا جس پر ہمہ اقسام کی رنگت کا روغن لگا ہوتا۔ صلاحیہ کے ۱۰۴ پارچہ جات، ۱۰۰ شیریں باف کے ٹکڑے اور شنباف کے ۱۰۰ ٹکڑے، موراز کے، ۵۰۰ پارچے یہ ایک قسم کا اونی کپڑا تھا جو متعدد رنگوں میں ہوتا ۱۰۰ ٹکڑے کتانِ رومی۔ ۱۰۰ بے آستین کے جبے، ایک خیمہ جس میں چھ خانے تھے چار طلای موم بتیاں اسی طرح چار ایسی جن پر چاندی کا ورق لپٹا ہوا۔ چار طلائی طشت اور چھ نقری اور دس اعزازی پوشاکیں زردوزی کے کام والی۔ دس ترکش بھی روانہ کئے گئے جن میں سے ایک پر موتی جڑے ہوئے تھے اور دس تلواریں اور اتنی ہی میانیں جن میں سے ایک پر موتی اور زیورات جڑے ہوئے تھے(57)۔ ضیاء الدین برنی کی ان اشیاء اور سوتی مصنوعات کی فہرست اشارہ کرتی ہے کہ علاء الدین کے عہد میں ان کی کیا قیمت تھی اور ابوالفضل کی نظر میں مغلوں کے زمانے میں۔(58)۔

غلام بطور اسلحہ ساز:

غلام اسلحہ بھی بناتے اور ان کے پرزے اور متعلقات جس میں مردوں کے لئے زرہ بکتر اور ہاتھیوں کی حفاظت کے لئے ایسی جالیاں جن پر سونے کا ملمع ہوتا۔(59)۔ جیسا کہ یہ مشہور ہے کہ فوج کے واسطے سب سے اہم عنصر بھاری بھر کم گھڑ سواروں کا رسالہ ہوتا تھا۔ گھوڑوں پر سوار سپاہی کمان سے مسلح ہوتے تاکہ فاصلہ پر واقع دشمن کو الجھائے رکھیں اور ان کے پاس ایک یا زیادہ ہتھیار رہتے تاکہ دو بدو لڑائی میں کام آئیں۔ جیسے نیزہ اور بلم، موٹھ دار جریب اور کمند۔ فخر مدبر کمان اور تلوار کو ترجیح دیتا ہے کیونکہ یہ گھڑ سوار کے موثر ہتھیار ہیں۔ یہ دونوں ہتھیار مختلف انواع کے ہوتے۔ ان سب میں سے ہندوتلوار سب سے اچھی ہوتی اور نہایت چمچماتی ہوتی (گوہر دار تار)۔ ان کی دور دراز اموی اسپین اور اناطولیہ کے سلجوقوں تک برآمد ایک مصدقہ بات ہے۔ وہ یہ بھی اعلان کرتا ہے کہ ہندوستانی نیزے سے بہتر کوئی اور نہیں ہے۔(60)۔ التمش کے دور سے فیروز شاہ کے عہد تک ہتھیاروں کے وضع کرنے اور ترقی میں بڑی پیش رفت ہوئی اور جنگ کے لئے انجن جیسے ارّعدا، منجنیق اور مغرابی ایجاد ہوئیں۔ یہ پتھر اور قذیفہ

PDF created with pdfFactory trial version www.pdffactory.com

لڑنے میں کام آتے۔'' ایسی بھانت بھانت کی اشیاء کے چوں چوں کے مربہ میں جیسے جال اور پھندے، گلے میں ڈالنے والے پھندے اور دام'' اس کے متعلق ہمیں ایک مختصر حوالہ ملتا ہے جو کوئی اوزار ہو جیسے۔۔۔ بندقہ (جو وینس کی بنی ہوئی لکڑی پر نصب کمان تھی جو پتھر کے گولے پھینکتی) فراقہ فلاکن (لنگر جو رسی کے بنے ہوتے اور پتھروں کو پھینکنے کے کام آتے) کمان گروہہ (بڑی سی گاڑی پر لدی ہوئی وینس کی کمان) حرف کلک (ایسے تیر جن کی نوکیں اندر کی جانب مڑی ہوتیں) جولاحق (پتھر کے گولے جنہیں مشین سے پھینکا جاتا) زندِ آتش (آتش زنی کرنے والا آتشیں فولاد) وغیرہ (61)۔ یہ جملہ ہتھیار اور ساز و سامان کو بنانے والے وہی ہزاروں غلام ہوتے اور ان اشیاء کو شاہی کارخانوں میں حفاظت سے رکھا جاتا۔

محل میں کام کاج اور دربار:

دھاوا بولنے والوں اور فاتحین کے لئے حکومت قائم کرنا اور اسے مستحکم کرنے میں کچھ وقت لگتا ہے۔ یہ سب کچھ ایک ارتقائی طریقہ کار سے حاصل ہوتا ہے۔ اس کی تکمیل کئی دہائیوں میں مکمل ہوتی ہے۔ قرون وسطیٰ میں یہ عمل خاندانی مناقشوں اور نئے فاتحین کی آمد سے تاخیر کا شکار ہوتا مگر بہت زیادہ نہیں۔ زیادہ تر مسلم قانونی کتب اور انتظامی احکام کی کتب بہ آسانی دستیاب تھیں جب ترک ہندوستان فتح کرکے اس پر حکومت کرنے کے لئے ٹک گئے۔ جہاں تک یادگاریں اور ایوان بنانے اور فوج میں خدمات انجام دینے کا تعلق ہے اور انتظامی مشین کو رواں رکھنے کے واسطے بھی غلاموں کی بہت بڑی تعداد درکار تھی۔ غلام تو ہر شعبہ حیات میں لکڑی کاٹنے والے اور پانی بھرنے والے تھے۔

وہ سرکاری محکمے جنہیں بڑی تعداد میں غلاموں کی ضرورت ہوتی وہ دیوان وزارت، دیوان عرض، دیوان انشاء اور دیوان رسالت تھے۔ وزارتوں، محکموں اور دفاتر کی فہرست اتنی طویل ہے کہ ان کا ذکر کیا جائے۔ محکمہ مال میں ہزاروں غلام درکار تھے، اسی طرح ہزاروں محکمہ ڈاک میں جو سرکاری مراسلات کے حمال ہوتے اور اس کے علاوہ جاسوس بھی۔ گنجائش کی کمی کے سبب اور تفصیلی معلومات کی کمی کی وجہ سے جو غلاموں کے کھپانے کے متعلق ہے۔ جو امراء کے امور خانہ داری اور دیگر اہم مسلم زعما کے متعلق ہے اس لئے ہم اپنے مطالعے کے اس پہلو کو سلطان کے محلوں تک محدود رکھیں گے کیونکہ وہ ''محض سلطان کے تصرف میں رہتے یا پھر اس کی بیگمات، داشتاؤں، خواجہ سراوں غلاموں اور کنیزوں اور ممالک رہتے تھے۔''

بادشاہ کے قصر میں ایک وقت میں کتنے غلام ہوتے یہ بتانا تو مشکل ہے۔ کوئی بھی صرف یہ کہہ سکتا ہے کہ سینکڑوں بلکہ ہزاروں، پھاٹک پر نوبت ہوتی یا شاہی سازندوں کا طایفہ جس میں ایک بڑی تعداد میں سازندے دھنیں بجانے کی باری باندھے رہتے۔ قرنا، ڈھول، FLA نلکی والے ساز وغیرہ۔ شاہی علم اور پرچموں کو اٹھانے کے لئے ہزاروں کی ضرورت ہوتی، تاکہ پنکھا جھلیں جس سے بادشاہ سلامت کے نزدیک مکھیاں نہ آئیں اور سر سراتی ہوا سے سکون ملے، چتر (آفتابی) اٹھانے کے لئے اور دور باش (شاہی عصا) اور تخت کے نزدیک خدام محل کے گھریلو عملے کے سربراہ سر جاندار اور سر سلحدار یا پھر شاہی ذاتی محافظوں کا کماندار اور شاہی زرہ بکتر کا سردار کہا جاتا سینکڑوں غلام اس لئے درکار ہوتے تاکہ ان کے فرائض کی ادائی میں مددگار بنیں دیگر سرکاری حکام جو خانگی خدام کے افسر ہوتے وہ سر آبدار (یا پھر مغلوں کے آفتابچی) کہلاتے وہ سلطان کے پاخانوں کی دھلائی اور صفائی کے انتظامات کے ذمہ دار ہوتے، اسی طرح شاہی متصدی خریطہ دار کہے جاتے اور تحویلداروں کے پاس رقوم رہتیں۔ ان تمام سرکاری اہلکاروں کے ماتحت غلام اور ملازموں کی فوج ہوتی۔ چاشنی گیر (جو مغلوں کے بکاول کا پیشرو تھا) شاہی مطبخ کا مکھیا ہوتا جس کے تحت سینکڑوں غلام کام کرتے تھے۔ سر جمعدار شاہی توشہ خانے کا افسر ہوتا۔ ساقی خاص شرابوں اور دیگر مشروبات کا۔ مشعل دار محل میں روشنی کا ذمہ دار ہوتا اور جس میں چراغوں کی فراہمی، موم بتیوں اور شمع دانوں کی فراہمی وغیرہ۔ ان تمام کارکنوں کے ماتحت مستقل عملہ ہوتا جن کا تعلق خاص طور پر غلاموں سے ہوتا۔ (62)۔

ہندوستان میں مسلم حکومت کو ''چلانے'' کے واسطے لاتعداد ماتحتوں اور غلاموں کی ضرورت ہوتی جو لاکھوں تک پہنچتی۔ مقتی اور بعد ازاں صوبہ دار چھوٹے موٹے بادشاہوں کی طرح رہتے ان کے دربار اور گھروں کے لوازمات ہو بہو شاہی طرز کے ہوتے۔ اقتداروں اور ماتحت افسروں کی سعی ہوتی کہ وہ بلند مرتبہ امرا کی پیروی کریں اور یوں غلاموں کی تعداد بڑھتی جاتی۔ سلطنت کے زمانہ عروج میں شہاب الدین العمرؔی کو محمد بن تغلق کے عہد کے متعلق یہ کہنا پڑا۔ اس شہزادے کی ذات پر ۱۲۰۰ معالجین ۱۰۰۰۰ عقاب یا باز دار جو گھوڑوں پر سوار ہوکر تربیت یافتہ عقابوں کو لئے رہتے۔ ۳۰۰ ہانکا کرنے والے شکار کرنے والوں کے لئے آگے آگے چلتے، ۳۰۰۰ ایسے کاروباری لوگ جو عقابی شکار سے متعلق اشیاء بیچتے اس کے ہمراہ چلتے جب وہ شکار کے لئے نکلتا۔ اس کے دسترخوان پر ۵۰۰ ساتھی ہوتے تھے۔ وہ ۱۲۰۰ اہل موسیقی کا مربی ہے جن میں غلام موسیقار شامل نہیں ہیں جن کی تعداد ۱۰۰۰ ہے جن کی زیادہ ذمہ داری موسیقی اور سازوں کی تربیت دینا ہے، اور ان میں تینوں زبان کے ۱۰۰۰ شاعر بھی ہوتے ہیں یعنی عربی، فارسی اور ہندوستانی، ایک مخبر کے مطابق جس کی روداد کا دارومدار شاہی باورچی کے بیان پر ہے ۲۵۰۰ بیل ۲۰۰۰ بھیڑیں اور دیگر جانور اور طیور روزانہ ذبح کئے جاتے اور شاہی مطبخ کو فراہم کئے جاتے۔ (63)۔ ان تمام خدمات اور تفریحات کے لئے کتنی تعداد میں غلام درکار ہوتے اس کے متعلق تو بہ آسانی قیاس آرائی کی جا سکتی ہے۔ مغلوں کے عہد میں ہمہ وقت بڑھتے ہوئے لوازمات کے واسطے غلاموں کی تعداد روز افزوں تھی۔ چند اعداد و شمار تو دستیاب ہیں مگر تفصیل دینا ممکن نہیں ہے۔

تفریحات اور کھیل کود کے شعبوں میں کتنے لوگ مصروف کار تھے وہ مجموعی طور پر بہت بڑی تعداد میں تھے۔ ان گنت عملہ خاص طور پر شکار اور برقندازی کے لئے رکھا جاتا، کچھ اور شکرے شکار کے واسطے مزید اور کبوتر بازی کی خاطر۔ تمام مسلم حکمراں اور امرا کبوتر باز لڑکے رکھتے۔ علاءالدین خلجی اکیلا ایسے کوئی ۵۰۰۰۰ رکھتا تھا۔ (65)۔ تربیت میں اس بات کی گنجائش رکھی جاتی کہ متعدد اقسام کے پرندوں کی لڑا کا جبلت کو فروغ دیا جائے ''یہاں تک کہ مینڈکوں سے لے کر مکڑیوں تک۔'' (66)۔ اصطبلوں میں جانوروں اور انسانوں کی وجہ سے تل دھرنے کی جگہ نہ رہتی۔ اصطبل میں جانوروں کی تعداد کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ شیر شاہ شاہی ڈاک کے رسل و [illegible]

PDF created with pdfFactory trial version www.pdffactory.com

غلام اور ملازمین:

شاہی پڑاؤ کے لئے گھڑ سواروں کے رسالے کے محافظین کے ساتھ ساتھ ۲۰۰۰ سے ۳۰۰۰ کے درمیان ملازمین بھی رکھے جاتے۔ ان کے پاس خاص طور سے ایک ایسا خرگاہ تھا جس کی تنصیب میں ۱۰۰۰ افراد کو ایک ہفتہ لگتا۔ (69)۔ جیسا کہ میں کہیں کہہ آیا ہوں یہ زمانہ اکبر "ہر پڑاؤ کے لوازمات کے ڈھونے کے لئے ۱۰۰ ہاتھی ۵۰۰ اونٹ ۴۰۰ چھکڑے اور سو کہار رکھے جاتے ان سب کی حفاظت کے لئے ۵۰۰ سپاہ کا دستہ ساتھ سفر کرتا۔ ان کے علاوہ ۱۰۰ فراشی ۵۰۰ منادی ۱۰۰ سقے ۵۰ بڑھئی۔۔۔ خیام اور مشعل بردار ہوتے، ۳۰ چمار اور ۱۵۰ خاکروب (70) اکبر کا "زنانہ" ۵۰۰۰ خواتین پر مشتمل تھا جن میں سب کو جدا جدا رہائش مہیا کی جاتی۔ ان کی خدمت پر نوکروں کی معقول تعداد مقرر کی جاتی اور ان کی حفاظت کے کئی دائرے ہوتے جن پر قلماقنیاں اور خواجہ سرا تعینات کئے جاتے۔۔۔ اور حمال الگ۔" (71)۔ ان معاملات کے لئے شہنشاہ نے ایسے ضوابط مقرر کر دیئے تھے اور ہر وہ شخص جو درباری عہدوں پر فائز ہوتا یا ان کی آرزو رکھتا وہ ان کی اس وقت تک مقدور بھر پیروی کرتا جہاں تک اس کے وسائل اجازت دیتے۔ ہر اہم خاتون کے واسطے دس سے بارہ ملازم مقرر کئے جاتے۔ چند شہزادیوں کے پاس سو کنیزوں تک ہوتیں (72)۔ شاہی محل کے اندر کی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے دور دراز سے اشیاء حاصل کی جاتیں بظاہر اس کو کوئی اہمیت نہ دی جاتی کہ اس پر کتنی محنت صرف ہو گی۔ شہنشاہ چاہے جہاں ہو اس کے استعمال کا پانی دریائے گنگا سے لایا جاتا یہ ایسی روایت تھی جو محمد تغلق سے اگر پہلے نہیں تو اس کے زمانے سے چلی آ رہی تھی۔ برف روزانہ ڈاک گاڑیوں اور برفیلے پہاڑوں سے دوڑنے والے قاصد کے ذریعے آتی۔ پھلوں کی رسد باقاعدگی سے کابل اور کشمیر سے آیا کرتی اور دور دراز مقامات سے بھی جیسے بدخشاں اور سمرقند۔ ہاتھ چھو کر بھاگنے والا بندوبست جو مذکورہ اشیاء کے لئے تھا اس کے واسطے سینکڑوں نہیں ہزاروں غلام درکار تھے۔ شہنشاہ کے ذاتی افسران۔ اپنے انتظامات انہی خطوط پر استوار کرتے تھے۔ "ایک صاحب نے ۵۰۰ مشعل برداروں کو ملازم رکھا دوسرے صاحب روزانہ ایک ہزار مقوی اور قیمتی ہانڈیاں پکواتے اور علیٰ ہذا القیاس" (73)۔ ترک اور مغل افواج میں معمولی حیثیت کا عہدیدار بھی جب لڑائی میں شریک ہوتا تو اس کے ہمراہ دو یا تین خدمت گار ضرور ہوتے۔ ایسا رواج صرف شہنشاہ اور اس کے مصاحبین تک محدود نہ تھا جیسا کہ ڈیلا ویل کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ سورت کے مقام پر ملازموں اور غلاموں کی اتنی کثرت تھی اور اتنے ارزاں تھے کہ "ہر ایک یہاں تک کہ معمولی مالی حیثیت کا ملازم بھی بہت بڑا ٹبر رکھتا ہے اور نہایت شاہانہ انداز میں اس کی دیکھ بھال ہوتی ہے۔ پایرارڈ کہتا ہے کہ کالی کٹ کا زامورن اپنے جلو میں ۱۳۰۰۰ افراد لے کر چلتا ہے اور ساحلوں کے نزدیک زعما کے پاس بالعموم بہت سے پیرو ہوتے ہیں۔ وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ دولت بیجاپور کے سفیر نے یہاں کوئی ریاست سی قائم کر لی ہے۔ وہ جب شہر کی جانب گامزن ہوتا تو اس کے ساتھ ملازمین کا ایک مجمع ہوتا جن میں بہت سے پیغام رساں، حمال، سائس اور موسیقار ہوتے اور یہ اضافہ کرتا کہ دکن کے تمام بڑے لوگ اسی قسم کی ظاہر داری میں غلطاں رہتے۔" تھیونوٹ بعد کے زمانے (۱۶۶۷ء) کے متعلق اسی سے ملتا جلتا احوال بیان کرتا ہے جو گولکنڈہ کی زندگی کے متعلق ہے۔ جہانگیر کے عہد میں شمالی ہند کے متعلق پلسیارٹ رقمطراز ہے۔ "چپڑاسی یا نوکروں کی تعداد ملک میں بے تحاشہ ہے، کیونکہ ہر ایک خواہ گھڑ سوار ہو سوداگر ہو یا بادشاہ کا اہلکار۔ اتنے بہت سے لوگوں کی ملازم رکھ لیتا ہے جتنی اس کی حیثیت اور حالات اجازت دیں۔ گھر کے باہر وہ جو بھی پیش کرتے ہیں وہ محض دکھاوا ہوتا ہے، اپنے آقا کے گھوڑے کے آگے وہ مسلسل بھاگتے رہتے ہیں اور درون خانہ وہ گھریلو کام کاج کرتے ہیں۔" جیسے بیلواں، فراش، مشعلچی اور مہاوت وغیرہ (74)۔ ڈبلیو۔ ایچ۔ مورلینڈ لکھتا ہے "کہ یہ سمجھ لیا جائے" "ملازمین کی کثرت جس کی وجہ سے ہندوستان پر نظریں اٹکتی ہیں (یعنی بیسویں صدی کے آغاز میں) کوئی نیا نویلا مظہر نہیں ہے، بلکہ درحقیقت اس رواج کی روبہ زوال باقیات میں سے ہے جو اکبر کے عہد سے اور بلاشبہ، اس سے بھی پہلے عہد کی یادگار ہے۔" (75)۔ بلاشبہ قطب الدین ایبک کے وقت سے لے کر ہمیشہ ہر صاحب خانہ یا سپاہی متعدد غلاموں کو رکھنے لگا۔ (76)۔ اس استحصال نے جو مغل حکمرانی میں رہا اس نے برطانوی افسروں اور لوگوں کو خدمتگاروں کے اس وقت غول در غول دیئے جب وہ ملک میں راج قائم کر کے اسے چلانے میں لگے تھے۔ (77)۔ انہیں یہاں کے مفلس لوگ ہاتھ آ گئے جو بطور قلی استعمال ہونے کو بیتاب تھے اور دساور بھیجے جانے کو بھی اور اسی طرح استحصال کرانے کو تیار تھے جیسا قرون وسطیٰ میں ترک اور مغل کر چکے تھے۔

PDF created with pdfFactory trial version www.pdffactory.com

باب۔۹

غلمان اور خواجہ سرا

غلاموں سے برتاؤ کا انحصار آقا کے مزاج، ترنگ اور تلون مزاجی پر ہوتا۔ کچھ آقا نرم دل ہوتے اور اپنے غلاموں سے نرمی سے پیش آتے، بہت سے درشتگی سے اور چند ایک قابل نفرت رویہ رکھتے۔ لیکن ان غلاموں میں ایک طبقہ ایسا تھا جن کو سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا وہ تھے غلمان اور مما لیک، اسی طرح خواجہ سراؤں سے بھی ان کے فرائض کی نوعیت کے سبب خصوصی سلوک کیا جاتا۔

مسلم سلاطین خوش شکل جوان غلاموں کے رکھنے کے بہت شوقین تھے۔ جنہیں وہ اپنے سائے کی طرح بطور پیغام رساں لڑکوں چھوٹی موٹی خدمات انجام دینے والوں، ذاتی محافظوں، خصوصی دستوں اور امرد مصاحبوں کی طرح رکھتے۔ ایسے غلاموں سے لحاتی فریفتگی مسلم فرمانروائی اور بالخصوص طبقہ امرا کی زندگی کے لئے ایک دائمی نحوست تھی۔ حالانکہ ان کی دانست میں اس کی حیثیت ایک رواج کی سی تھی۔ پی۔ کے۔ ہٹی ان کے متعلق یہ کہتا ہے ''غلمان جن میں خواجہ سرا بھی ہو سکتے تھے وہ اپنے آقاؤں سے خصوصی مراعات پانے والوں میں تھے، ہمیشہ قیمتی اور دلکش وردی زیب تن کرتے اور اکثر اپنے جسموں کو حسین بنانے کے علاوہ مختلف خوشبویات سے معطر رکھتے جس میں زنانہ انداز و اندام کا رواج ظاہر ہوتا۔ ہمارے مطالعے میں غلمان پہلی مرتبہ ہارون الرشید کے عہد میں آتے ہیں لیکن یہ مبینہ طور پر خلیفہ الامین تھا جس نے ایرانی روایت کی پیروی میں عرب دنیا میں غلمان کا ادارہ قائم کیا تاکہ غیر وضع فطرت جنسی تعلقات رواج پا سکیں۔ ایسا ہی ایک قاضی یا جج تھا جس کے متعلق دستاویزی شہادت ملتی ہے کہ اس کے پاس ایسے چار سو نوجوان تھے۔ شاعروں نے بھی کبھی اپنے مریضانہ جذبات کی سرعام مذمت نہ کی اور نہ انہوں نے اپنے تعشقانہ تخلیقات کی اصلاح کی کوشش کی جن کا تعلق بے ڈاڑھی مونچھ والے نوجوان لڑکوں سے ہوتا۔(1)

ہندوستان کے مسلم حکمران اور امراان ''انحرافی جذبات'' میں پیچھے نہ رہے۔ محمد ہندوشاہ فرشتہ اپنی کتاب ''تاریخ'' میں اور خوندامیر اپنی، دستور الوزراء میں محمود غزنوی کے متعلق اس واقعہ کی جانب بیان کرتے ہیں۔ سلطان محمود کو ایسے غلاموں اور خوبصورت چہروں والے غلاموں کا بہت شوق تھا۔ اس کا وزیر ابوالعباس فضل بن احمد اسی کے نقش قدم پر چلتا۔ ''فضل نے ترکستان میں کسی لڑکے کی خوبصورتی کے متعلق جب سنا تو اس نے اپنے کسی با اعتماد ماتحت کو اس لڑکے کو خریدنے کو کہا (اس کا چہرہ بالکل سیارہ زہرہ کی مانند خوبصورت تھا) اور اسے غزنی لانے کو کہا اور ایسی سواری میں بٹھا کر جن میں عورتیں سفر کرتی تھیں۔ جب کسی مخبر نے بادشاہ کو یہ ماجرا سنایا تو اس نہایت لائق تعظیم جلالت مآب نے اپنے وزیر سے اسے پیش کرنے کا حکم دیا۔۔۔ وزیر نے جواب میں ٹال مٹول سے کام لیا اور جلالت مآب کے مطلق اختیارات کے باوجود مذکورہ غلام سے دستبردار نہ ہونے پر اڑ گیا۔ ایک دن رات میں بادشاہ وزیر کے گھر نازل ہو گیا (بغیر کسی اطلاع کے) جہاں پر وزیر نے بادشاہ وقت کے شایان شان اور عزت واحترام کے ساتھ خاطر مدارت کی۔ جب وہی غلام (جو بہشت کی حور لگ رہا تھا) بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو گفتگو میں اس سے اور وزیر کے مابین تیز تیز باتوں کا تبادلہ ہوا اور بادشاہ کا غصہ اتنا بھڑکا کہ اس نے احکام جاری کر دیے کہ وزیر کو گرفتار کر لیا جائے اور اس کے گھر کو لوٹ لیا جائے۔ اس کے بعد بادشاہ ہندوستان کے لئے روانہ ہو گیا اور چند خبیث امیروں نے وزیر پر دندانے دار سلاخ سے ایسا تشدد کیا کہ وہ جان کی بازی ہار گیا۔'' اس کے بعد بوڑھے خواجہ احمد بن حسن میمندی کو وزارت کے مرتبہ پر فائز کیا گیا۔

سلطان محمود کے دربار کی حفاظت چار ہزار بے ریش خوبصورت اور نوجوان (غلام ترک وشاق) جوان دنوں میں جب عوامی دربار ہوتا تو انہیں تخت کے دائیں اور بائیں جانب کھڑا کیا جاتا۔ ان میں سے دو ہزار ایسی ٹوپی پہنے ہوتے جن پر چار کلغیاں لگی ہوتیں، جو طلائی عصائیں لئے ہوتے اور داہنے ہاتھ پر استادہ ہوتے اور باقی ماندہ دو ہزار جن کی ٹوپیوں میں دو کلغیاں ہوتیں چاندی کے عصا لئے ہوتے اور بائیں جانب ہوتے۔ جب ان کی جوانی مردانہ دہلیز پر قدم رکھنے لگتی اور ڈاڑھی میں بال آنے لگتے تو انہیں ایک علیحدہ دستے سے منسلک کر دیا جاتا اور کبھی کبھار انہیں صوبوں کے حاکموں کی کمان میں دے دیا جاتا۔ شمس سراج عفیف نے سلطان فیروز تغلق کے دور میں خوش شکل غلام لڑکوں کے حصول اور تقسیم کاری کی جو تفصیل دی ہے وہ بھی ایسے ہی انتظامات کی جانب اشارہ کرتی ہے۔

شاہی غلاموں (بندگان خاص) کی تعداد بالعموم بہت زیادہ ہوتی تھی۔ وہ بہرحال خوش جمال ہوتے نوعمری میں پکڑے ہوئے یا پھر خریدے ہوئے۔ اسی طرح دساور میں خریدے جانے والے غلاموں کا انتخاب کیا جاتا۔ ان ہی میں سے سلطانوں کے پسندیدہ بن جاتے اور اعلیٰ رتبوں پر پہنچ جاتے جیسے علاء الدین خلجی کے تحت کافور ہزار دیناری اور قطب الدین مبارک خلجی کے عہد میں خسرو خان ہو گیا تھا۔ علاء الدین خلجی کے گجرات پر فوج کشی کے دوران اس کے سپہ سالار وہاں سے بہت مال و دولت لائے جس میں راجہ کرن کی بیوی کملا دیوی اور وجیہ و شکیل غلام ملک کافور ہزار دیناری بھی شامل تھا۔ سلطان دونوں ہی پر فریفتہ ہو گیا۔ بقول فرشتہ اس نے کملا دیوی کو مسلمان کر کے شادی رچالی اور کافور کو اپنا منظور نظر بنالیا ''اس نے مقدس تاگہ (زنار) برائے محبت اس کی کلائی میں باندھا۔'' (4)۔ ایسے ہی حالات میں خسرو خان کو مالوہ سے لایا گیا۔ ان کو نیوں کے عروج میں زیادہ ہاتھ ان کے ''حسن'' اور بادشاہ سے قربت کے علاوہ ان کی مرادوں اور سازشی ذہن پر منحصر تھا۔ جب تک علاء الدین کی گرفت اپنی انتظامیہ پر کڑی رہی تب تک ملک کافور نے اس کی خدمت و وفاداری سے کی اور اس کی نیابت کر کے طول و عرض میں فتوحات حاصل کیں۔ ایک دفعہ جب بادشاہ کی صحت گرنے لگی تو

PDF created with pdfFactory trial version www.pdffactory.com

اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لئے۔ جب قطب الدین مبارک شاہ کا وقت آیا تو وہ اپنے مرغوب خسرو خان پر عاشق ہو گیا۔ جیسا ملک کافور کے ساتھ ہو چکا تھا۔ خسرو خان قطب الدین کو بھی خوش کرتا رہتا اور ساتھ ہی ساتھ جب افواج کوچ کرتیں تو اس کے محروسہ علاقوں میں استحکام پیدا کرنے کے علاوہ آقا کی مفتوحات میں وسعت دیتا جاتا۔ مگر جیسے ہی اسے ایک موقع ہاتھ آیا اس نے اپنے مربی کو قتل کر ڈالا۔ مبارک خلجی محض اس لئے اپنی جان سے گیا کیوں کہ وہ قبیح فطرت تھا۔ اس کا پسندیدہ غلام اور وزیر خسرو خان (۱۳۱۸ء) میں جنوب کی جانب ایک مہم پر سپہ سالار بن کر روانہ ہوا جہاں اسے بہت زیادہ مال غنیمت ہاتھ آیا۔ جیسا کہ اس سے پہلے شہزادہ علاء الدین کے ساتھ ہو چکا تھا دکن کی دولت نے خسرو خان کی آتش مراد کو بھڑکا دیا اور اس نے دہلی کے تخت پر قبضہ کرنے کا منصوبہ بنانا شروع کر دیا۔ سلطان کی بد چلنی کے سبب اس کا منصوبہ جلد ہی پھلنے پھولنے لگا۔ خسرو خان کی محبت میں قطب الدین مبارک شاہ اندھا ہو چکا تھا اور اس کے لئے اس کی جدائی برداشت سے باہر ہو گئی اس لئے خسرو کو دکن سے طلب کیا گیا، خسرو خان کو ایک تیز رفتار پالکی پر دکن سے دہلی بھیجا گیا جہاں وہ ایک ہفتے میں پہنچ گیا۔ ایک دن خسرو نے اسے تنہائی کی بے تکلفی میں قتل کرا دیا۔(6)۔ مرغوب غلاموں کو پالکیوں میں سفر کرانے کی روایت لگتا ہے اتنی مقبول تھی کہ سلطان سکندر لودھی (۱۴۸۹ء۔۱۵۱۷ء) نے فخریہ کہا کہ ''اگر میں اپنے غلام کے متعلق حکم دوں کہ اسے پالکی میں سوار کرایا جائے تو میرے امراء کے تمام ارکان میرے کہنے پر پالکی کو کندھوں پر اٹھا کر چلنے کو تیار ہو جائیں گے۔''(7)۔ اس واقعے سے اتفاقاً اس خیال کی ترسیل ہوتی ہے کہ خوبرو پسندیدہ غلاموں کو کتنی اہمیت ملتی تھی اور اس سے یہ جھلکتا ہے کہ جابر مسلمان حکمرانوں کے تحت امرا کی کیا وقعت تھی۔

قرون وسطی کی ہندوستان کی تاریخ غلمانوں سے عشق کی داستانوں سے پٹی پڑی ہے۔ اس لئے انہیں ہمیں یہاں دہرانا نہ چاہیے اور نہ ہی مزید خامہ فرسائی کرنا چاہئے۔ یہاں اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ غلام لڑکوں کا عشق بادشاہوں کو ایسا اندھا کر دیتا جس سے نہ صرف ترک اور غیر ملکی غلاموں کو بلکہ ہندوستان نژاد غلاموں کو بھی مواقع فراہم ہو جاتے کہ تاجداری پر قبضہ کرنے کے واسطے ایسے ہتھکنڈوں سے کام لیں جن میں سازش کرنے، زہر خوانی اور بذریعہ تلوار کام تمام کرنا شامل تھے۔ ہند نژاد اور مذہب تبدیل کر لینے والے غلاموں کو کبھی بھی اپنے غیر ملکی ہمسروں کے برابر نہ سمجھا جاتا۔ انہیں ہمیشہ غیر ملکی مسلمان بہ نظر تحقیر دیکھتے۔ مگر خوش رو اور پسندیدہ دوسرے زمرے میں آتے۔ مرادوں اور سازشوں کے علاوہ ان کے عاقبت نا اندیش کرتوت کی چند اور وجوہ بھی تھیں۔ آقاؤں کا یہ شعار تھا کہ وہ ہمہ وقت بد چلنی میں تر بتر رہتے۔(8)۔ وہ اپنے غلمانوں کو غیر فطری دبری کاموں کے واسطے استعمال کرتے۔ ان افعال کے نتیجے میں غلام آزردہ ہو جاتے اور انتقام پر اتر آتے۔ گذشتہ مثالوں سے غلاموں کی ہمت افزائی ہوتی۔ اگر بلبن سلطان ناصر الدین کو زہر دے سکتا ہے اور علاء الدین خلجی اپنے مربی کو سرعام قتل کر سکتا ہے تو ملک کافور اپنے آقا کو کیوں نہ قتل کرے۔ اگر ملک کافور تخت حاصل کرنے کے لئے جتن کر سکتا ہے تو خسرو خان ایسا کیوں نہ کرے۔ بے راہ روی اتنے بڑے پیمانے پر ہو رہی تھی کہ برنی بڑے پُر حسرت انداز میں لکھتا ہے کہ غیاث الدین تغلق اس بدی سے محفوظ تھا اور اس نے ''خوش جمال اور بے ریش'' کو اپنے قریب نہ پھٹکنے دیا اور تمام اخلاق باختہ لوگوں کو اپنا دشمن سمجھا۔(9)۔ ابن بطوطہ کے بیان کے مطابق سلطان اور اس کے بیٹے محمد کے درمیان کشیدگی کی وجہ میں سے ایک یہ تھی کہ شہزادہ غلاموں کی خریداری میں نا روا فضول خرچی پر اتر آتا۔(10)۔

لیکن سب ہی غلام اور غلمان ان اعلیٰ مراتب تک نہ پہنچ پاتے کیونکہ وہ تعداد میں ہزاروں ہوتے اور سب برابر نہیں ہو سکتے تھے۔ علاء الدین کے پاس اپنے ذاتی دستے تھے جن میں کوئی پچاس ہزار غلام تھے۔ محمد تغلق ۲۰۰۰۰ رکھتا تھا اور فیروز تغلق ۴۰۰۰۰۔(11)۔ محمد تغلق غلاموں کی اتنی بڑی تعداد رکھتا تھا کہ اسے ہفتہ کا ایک دن مختص کرنا پڑا جس دن وہ ان میں کچھ کو پروانہ آزادی دیتا اور پھر ان کی شادی کر دیتا۔(12)۔ پورے قرون وسطی میں یہی صورتحال رہی۔ اگر چہ شمس سراج عفیف نے فیروز تغلق کے عہد کی جو تفصیلی روداد لکھی ہے اس سے تو یہی تاثر پیدا ہوتا ہے کہ فیروز دہلی سلطنت کے تمام بادشاہوں کے مقابلے میں خوبصورت غلاموں کے حاصل کرنے اور نگہداشت کرنے میں سب پر بازی لے گیا۔ اس لئے عفیف کا قدرے تفصیلی حوالہ دینا پڑے گا۔

''غلاموں کے حصول میں سلطان بہت محتاط تھا اس بابت اس نے عاملین اور جاگیرداروں کو ایک فرمان جاری کیا کہ جب حالت جنگ میں ہو تو غلاموں کو پکڑو اور ان میں سے منتخب کو نکال کر دربار کی خدمت کرنے کے لئے روانہ کر دو۔ جب بھی جاگیرداروں کے تابعین دربار کا پھیرا لگاتے تو ان میں سے ہر ایک اپنی استطاعت کے مطابق حسین غلاموں کو اپنے ساتھ لاتا جو صاف ستھرے لباس پہنے ہوتے شاندار ٹوپیاں دھرے پگڑیوں اور موزوں سے آراستہ مختصراً رواج کے مطابق نہایت اعلیٰ زیب و زینت کئے ہوئے۔ جب وہ دربار میں سالانہ حاضری کی غرض سے آتے تو وہ دیگر اشیا کے علاوہ سلطان کے لئے غلاموں کو بھی لاتے۔۔۔۔ یہ ضابطہ چالیس برس تک پورے دور حکمرانی میں نافذ العمل رہا۔ ایسے سردار جو بہت سے غلاموں کو پیش کرتے ان پر زیادہ نوازشیں ہوتیں اور ایسے جو مقابلتاً چند ایک غلام لاتے تو انہیں اسی تناسب سے کم توجہ کا مستحق سمجھا جاتا۔ اور جب مذکورہ سردار سلطان کی غلاموں کے لئے بے تابی بھانپ لیتے اور یہ بھی کہ ان کے حاصل کرنے والی مساعی کو بہت سراہا جا رہا ہے تو وہ اپنی کوششوں کو دو چند کر دیتے اور لائے جانے والے غلاموں کی تعداد میں ہر سال اضافہ ہوتا جاتا۔''

''غلاموں میں سے چند ایک اپنا وقت لکھنے پڑھنے میں اور مقدس کتاب کے حفظ کرنے میں صرف کرتے دیگر مذہبی تعلیمات میں کچھ کتابیں نقل کرنے میں۔ چند ایک کو سوداگروں کے حوالے کر دیا جاتا تا کہ وہ کاروباری ہنر سیکھیں، یوں کوئی ۱۲۰۰۰ غلاموں کو مختلف نوعیت کے کاموں میں کاسب (Artisans) بن گئے۔ سب در حقیقت دار السلطنت میں اور مختلف جاگیروں میں ملا جلا کر ۱۸۰۰۰۰ غلام موجود تھے۔ صحیح بات تو یہ ہے کہ کوئی ایسا پیشہ نہ تھا جس میں فیروز شاہ کے غلام نہ جتے ہوں۔ جب غلاموں کی تعداد بہت زیادہ ہو جاتی تو ان میں سے کچھ کو امرا اور ملک کو دے دیا جاتا۔ یہ امرا ان سے بچوں کی طرح سلوک کرتے انہیں کھلاتے پلاتے اور پوشاک مہیا کرتے ان کی رہائش کا بندوبست کرتے اور انہیں تربیت دلاتے اور ان کی تمام ضرورتوں کو پورا کرتے۔۔۔(13)

یہ بات یہاں برمحل ہوگی کہ میجر راورٹی کے مشاہدے کا بھی اضافہ کر دیا جائے۔ ''ایک عام قاری کے لئے یہ معلومات دی جا رہی ہیں جو مشرقی معاشرت کی روایت سے ناواقف ہے اس کے لئے جب میں مملوک اور غلام کا ذکر کروں گا جس سے مراد ''غلام'' ہو گا لیکن اسے ان معنوں میں غلام نہ جانے جو ہماری زبان میں لئے جاتے ہیں۔ ان غلاموں میں کبھی پکڑے جانے والے اسیر ہوتے ہیں بلکہ اکثر و بیشتر یہ ترک نسل کے لڑکے ہوتے ہیں جنہیں بادشاہ اور ان کے بڑے امرا بردہ فروشوں اور غلاموں کے

PDF created with pdfFactory trial version www.pdffactory.com

صوبے دار مقرر کیا گیا اور فوجوں کا سپہ سالار بھی۔۔۔''(14)۔

جنگوں میں پکڑا گیا ہو یا خریدا گیا ہو۔ ہندوستانی غلاموں کو روایتی شرائط میں ہمیشہ نہیں رکھا جاسکتا بلکہ ہر معاملے میں غلمان اور ممالیک کے واسطے خصوصی گنجائش رکھی جاتی وہ بھی فراخی کے ساتھ جس میں تنخواہ، اشیائے ضرورت، وظائف اور جاگیریں تک شامل ہوتیں۔ محمد بن تغلق کے دور حکومت میں العمری کے مطابق ''سلطان کے ذاتی غلاموں کو فی کس دو من گیہوں اور چاول اور تین سیر گوشت بطور روزینہ کے ملتا جس کے ساتھ تمام دیگر ضرورتیں اس کے علاوہ اسے دس تنکہ ماہانہ دیا جاتا اور سالانہ چار جوڑے کپڑے۔(15)۔ فیروز تغلق کی حکمرانی میں ''ایسے جنہیں شہر (دارالسلطنت) کے اندر رکھا جاتا انہیں تنخواہ نقدی کی صورت میں ملتی چند ایک کو سو تنکے دیگر کو پچاس یا تیس اور پچیس تک۔ لیکن کسی کو بھی دس تنکہ سے کم نہ ملتی۔'' اپنے غلاموں کی سلطان بہت دیکھ بھال کرتا، یہ عفیف کا بیان ہے۔ ایک خاص حاضری کھاتہ (مجموع دار) غلاموں کے واسطے ہوتا اور وزارت غلامان (دیوان بندگان) ہوتی جسے علیحدہ قائم کیا گیا تھا اور اپنی حیثیت میں وہ دیوان وزارت یا وزارت خزانہ سے جدا ہوتی۔(16)

سلطانوں کی غلاموں کی ناز برداری سے چہار جانب رشک وحسد کے جذبات پیدا ہوجاتے۔ حسد سے نسلی رقابت فروغ پاتی۔ آقا کے لطف وعنایت کے عوض میں اسے غلاموں کی وفاداری ملا کرتی۔ جو دوررس معاملات میں غلاموں کے لئے ضرررساں ثابت ہوتی۔ علاءالدین خلجی کی موت کے بعد اس کے غلاموں کو سفاکی سے قتل کر دیا گیا۔(17) اسی طرح فیروز تغلق کی موت کے بعد اس کے وفادار غلاموں کو ایسے ہی انجام سے دوچار ہونا پڑا۔ نئے تاجور شہزادہ محمد نے فیروز کے غلاموں کو تین دن میں دہلی چھوڑ دینے کو کہا جو بچ نکلے وہ سلامت رہے۔ دیگر اور بالخصوص جو پوربی اور بنگالی، زبان بولتے تھے انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ ان 'نجس' باغیوں نے تاج کو گردش میں ڈال دیا اور اس طرح پیش آنے لگے جیسے عملاً وہی بادشاہ گر ہوں، فیروز کے آمادہ پیکار وارثان تخت شہزادوں نے تو یہی تاثر چھوڑا۔ ان غلاموں میں تو بس ایک ہی کجی لگتی تھی اول یہ کہ وہ اصل (پیدائشی اور خالص) مسلمان نہ تھے دوئیم یہ کہ وہ فیروز تغلق اور اس کے اقربا کے وفادار تھے۔(18)۔ یہ فرشتہ کی روایت ہے۔ درست وجہ چاہے جو بھی ہو فیروز کی موت کے بعد ''اس کے پسندیدہ غلاموں کے سر بڑی بے رحمی سے قلم کر دیئے گئے اور دربار میں ان کا ڈھیر لگ گیا۔''(19)۔ ''فیروز کی موت کے دس سال بعد تک شہزادے داؤ پیچ میں لگے رہے، امرا سازشوں میں اور عوام بھگتان بھگتتے رہے۔''(20)۔ ہر نیا سلطان اور وہ سب جو اقتدار میں بڑے تواتر سے آتے رہے۔ یہی چاہتے تھے کہ ان کے امرا اپنے حلقے کے ہوں اسی طرح غلاموں کا اپنا دستہ ہو اور ماسبق کو وہ تباہ وبرباد کردیتے۔ مختصراً یہ کہ غلاموں کو اپنی کسی خطا کی وجہ سے غلام نہ بننا پڑتا اور ان کا جتھوں کی صورتوں میں قتل عام کیا جاتا ان کا محض یہ قصور ہوتا کہ وہ اپنے آقاؤں کے غلام تھے۔

خواجہ سرا۔ مخنث:

سب ہی تو نہیں مگر غلاموں میں اکثریت خواجہ سرا ہوتے۔ آپ یہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ کوئی مسلمان بادشاہ حرم نہ رکھتا ہو اور بغیر خواجہ سرا کے حرم کا وجود حاشیہ خیال میں نہیں آسکتا۔ خواجہ سرا حرم کے محافظین اور سرپرست ہوتے جس طول وعرض کا مغل حرم ہوتا وہ باسیوں اور یہاں تک کہ بادشاہ تک کہ لئے حفاظتی نقطہ نظر سے ہمیشہ ایک خطرہ ہوتا جب تک خواجہ سرا اس کی حفاظت باقاعدگی سے نہ کرتے۔ یہ محل کے پھاٹکوں کے محافظ ہوتے، پروانہ راہدی کا معائنہ کرتے اور نفوس کے داخل ہونے اور خارج ہونے پر کہ وہ کتنے مرد اور عورتیں تھیں۔ وہ حرم سرا کے باسیوں کی خدمت بھی بجالاتے۔ نگران کی سرگرمیوں پر سائے کی طرح لگے رہتے۔(21)۔ مسلم حکمرانی کے زمانے میں حرم سب محکموں سے بڑا محکمہ ہوتا۔ کوئی بھی سرگرمی چاہے وہ دربار سے متعلق ہو یا انتظامیہ سے اور چاہے اس کا تعلق کسی طرح سے حرم سے ہو یا نہ ہو۔ اس لیے مسلم بادشاہ اور اس کے حرم کی خدمت کرنے کے لئے لاکھوں کی تعداد میں خواجہ سراؤں کی ضرورت ہوتی۔ ان کے عہدے موروثی ہوتے۔ عرصہ دراز سے ملازم خواجہ سراؤں کو ناظر کیا جاتا اور ان میں سے ہر ایک کے ماتحت کئی خواجہ سرا ہوا کرتے۔(22)۔

یہ مسلم تاریخ کی ایک معنی خیز حقیقت رہی ہے کہ سلطنت دہلی اور مغل شہنشاہیت میں نامور امرا خواجہ سرا ہوئے ہیں۔ عمادالدین ریحان جو بلبن کے عہد میں وزیر اعلیٰ رہا، کافور ہزار دیناری علاءالدین کے زمانے میں سپہ سالار اور نائب سلطنت تھا۔ اور خوراؤ شاہ جو قطب الدین مبارک خلجی کا منظور نظر تھا جو بالآخر بادشاہ بنا، سب ہی خواجہ سرا تھے۔ خواجہ جہاں ملک سرور ایک حبشی خواجہ سرا جسے سلطان محمود نے وزیر مقرر کیا تھا اور سلطان فیروز تغلق کا جانشین ہوا۔ ۱۳۹۴ء میں اسے جون پور کا صوبیدار بنا کر بھیجا گیا اور اسے مالک الشرق (مشرق کا آقا) کا خطاب دیا گیا۔ مختصر سے عرصہ میں وہ ایک بڑے علاقے کو اپنے تسلط میں لے آیا جو مغرب میں کول (علیگڑھ) سے لے کر مشرق میں ترہٹ بہار تک پھیلا ہوا تھا اور سلطان الشرق کے نام سے مشہور ہوا۔ اس کی موت پر اس کے لے پالک بیٹا قرنفل (کالی لونگ) نے مبارک شاہ کا لقب اختیار کیا اور اپنے نام کے سکے جاری کئے۔(23)۔ مغلوں کے عہد میں متعدد خواجہ سراؤں نے ترقی کرکے منصب دار کا عہدہ حاصل کر لیا اور انہیں ناظر کہا جاتا تھا اور خواجہ سرا بھی انہیں فوجوں کا سپہ سالار (جنرل) مقرر کیا گیا اور صوبیدار بھی۔ خواجہ سراؤں کے ناظر اعلیٰ کو بالعموم اعتماد خان کے لقب سے سرفراز کیا جاتا یا اعتبار خان۔ ایک اعتبار خان جس نے بابر اور ہمایوں کے زمانے میں خدمات انجام دیں اسے شہنشاہ اکبر نے بعد ازاں دہلی کا گورنر مقرر کیا۔ ایک اور اعتماد خان ایک ہزار کا سپہ سالار بنایا گیا اور اسے اکبر نے ملکی مالیات کے امور کو سدھارنے کی ذمہ داری سونپ دی۔ اسی نے ۱۵۷۶ء میں فتح بنگال میں حصہ لیا اور بعد میں بھکر کا صوبیدار مقرر کیا گیا۔ ایک اور اعتماد خان جو اکبر کی ملازمت میں تھا وہ مکہ مکرمہ حج کی نیت سے گیا جہاں سے وہ ایک پتھر کی بڑی سی سل لایا جس پر رسول اللہ کے پیر کا نشان ثبت تھا۔(25)۔ اسے گجرات کا صوبیدار مقرر کیا گیا اور اس کا عہدہ چار ہزاری تھا۔ اعتبار خان جو جہانگیر کا مخنث اعظم تھا وہ آگرہ کا صوبیدار بھی تھا۔ ایک ہیجڑا فیروز خان تھا جسے جہانگیر نے ۱۵۰۰/۶۰۰ کا منصب عطا کیا۔(27)۔ بختاور خان (۹۔۱۶۹۸ء) جسے اورنگ زیب نے خواجہ سراؤں کا ناظم اعلیٰ مقرر کیا اس کے پاس ایک ہزاری کا عہدہ تھا۔ وہ متبحر عالم اور مورخ بھی تھا۔ اس نے تاریخ الفی اور اخبار الاخبار کی تلخیص تیار کی اور مراۃ عالم تصنیف کی 'جو مراۃ جہاں نما' کے نام سے مشہور ہوئی۔(28)۔ مغلوں کے بعد کے حکمرانوں کے دور میں تین ہیجڑے میاں خوشفہاں میاں ارجمند اور مبارک مہابت نے مغلانی بیگم (۱۷۵۴ء۔۱۷۵۶ء) کی نیابت کی اور ریاستوں پر حکمرانی کی۔(29)

PDF created with pdfFactory trial version www.pdffactory.com

مالک ہے جو سراپا (لباس) کی تفصیلات کا فیصلہ کرتا ہے اور وضع قطع تک کہ کیسے سلیں۔مختصراً یہی وہ صاحب ہیں جو مغلوں کے لباس، کتان اور چادروں، ہیروں اور جواہرات، زیورات اور ہر اس شئے پر نظر رکھتا ہے جو محل میں جاتی ہے یا وہاں سے نکلتی ہے۔(30)۔منوکسی کوئی چالیس ناظروں کی فہرست دیتا ہے جو اورنگ زیب کے عہد میں خدمات انجام دے رہے تھے۔ان میں سے ہر ایک کو بادشاہ نے خصوصی اعزاز سے سرفراز کیا تھا۔وہ بادشاہوں اور ملکاؤں کی جو خدمات انجام دیتے اس سے خواجہ سراؤں کو بہت اثر و رسوخ حاصل ہو جاتا اور بہت سی دولت بھی جمع کر لیتے۔(31)۔اس میں شک نہیں کیا جا سکتا کہ ان میں سے کچھ نہایت قابل اعتبار ہو جاتے اور اتنے با اختیار ہو جاتے کہ نوجوان شہزادے بھی ان کے کڑے نظم وضبط کے تابع رہتے۔(32)۔

کبیر مخنثوں یا خواجہ سراؤں کے ماتحت کم مرتبہ خواجہ سرا ہوتے۔منوکسی کے بقول ''یہاں ہمیشہ ایک چھوٹا سا دستہ ضرور ہوتا ہے۔جو سب کو ہدایت دیتا ہے اور ہر چیز پر نظر رکھتا ہے جسے محل میں جانا ہے۔(33)۔نچلے درجہ کے خواجہ سراؤں میں سے کچھ حرم میں پیغام رسانی کا کام کرتے تھے۔دیگر کو دروازوں پر تعینات کیا جاتا تا کہ محل میں آنے جانے والوں پر نظر رکھیں اور اس کو مدنظر رکھیں کہ کوئی نامطلوب شخص حرم سرا میں داخل نہ ہونے پائے۔(34)۔ان میں سے کچھ کی ذمہ داری یہ تھی کہ وہ شہزادوں کی تعلیم کے امور کی دیکھ بھال کریں۔بغ نی آغ (برنیر) لکھتا ہے کہ مغل شہزادوں کی تعلیم وتربیت زمانہ طفلی سے ہی عورتوں اور خواجہ سراؤں کے زیر سایہ ہوتی تھی۔روسی غلاموں، شیر کاسیا۔۔۔گرجستان (جارجیا) یا پھر ایتھوپیا جن کے ذہن ان کے کام کاج کی نوعیت کی وجہ سے ابتذال کے مارے ہوتے، اپنے بالا دستوں کے سامنے غلامانہ ذہنیت اور گھٹیا پن سے لبریز، یہی شہزادے اپنے دست نگروں کے لئے مستبد ہوتے۔۔۔اور جب حرم سرائے سے رخصت ہوتے تو قطعاً بے خبر۔(35)۔

مختنوں کا سب سے اہم کام یہ تھا کہ وہ حرم کی عورتوں کی حفاظت کریں اور ان کی سرگرمیوں پر نظر رکھیں۔چونکہ وہ ہمہ وقت حرم سرا میں حاضر رہتے یوں وہ ان کی خدمت کرتے اور مختلف طریقوں سے مددگار بنتے۔مخنث اپنی مالکنوں کے رازوں کے امانت دار ہوتے۔وہ نشہ آور ادویات اور شرابیں خاموشی سے حرم میں پہنچا دیتے۔وہاں کی خواتین بسا اوقات خواجہ سراؤں کی مدد سے حرم میں مردوں کو بھی بلوا لیتیں۔منوکسی بڑے وثوق سے بتاتا ہے کہ خواجہ سرا زنان خانوں میں مردوں کو چوری چوری پہنچا دیتے۔(36)۔ان نازک اور جاں جوکھم میں ڈالنے والی خدمات کے عوض خواجہ سراؤں کو ہر وہ چیز مل جاتی ''جس کی انہیں خواہش ہوتی''۔ کیونکہ وہ ان گاہک خواتین کو راز فاش کر دینے کی دھمکی دے کر ان سے مطالبات منوا لیتے۔یہ فطری بات ہے کہ حرم کی چند عورتیں تو خواجہ سراؤں کو ان کی جنسی استعداد کی حد تک متمتع ہونے کی بھی اجازت دے دیتیں۔(37)۔یہ لوگ شہزادوں اور ان کی حرم سرا کی محبوباؤں کے درمیان نامہ و پیام کی خدمات بھی انجام دیتے۔(38)۔ایسے ہی کئی چھوٹے موٹے راز دارانہ کام ہوتے جو کبھی کبھار خواجہ سراؤں کو بہت با اختیار بنا دیتے، ان میں تکبر آ جاتا اور بے جا خودنمائی پیدا ہو جاتی۔(39)۔

مختصراً مسلم حکمرانی کے دوران میں شاید ہی کوئی ایسا شعبہ ہو جس میں خواجہ سراؤں کی اس لئے ضرورت نہ پڑے کہ وہ کوئی اہمیت والا کردار ادا نہ کریں۔وہ جنگوں میں لڑتے اور بادشاہتوں کو فتح کر لیتے، وہ بڑے انتظامی عہدوں پر فائز کئے جاتے انہیں گورنر متعین کیا جاتا اور فوجوں کے کماندار بھی۔انہوں نے حرم کے معاملات میں گراں قدر خدمات انجام دیں۔انہوں نے عالی مرتبت خواتین کی حالت سفر میں حفاظت کے فرائض بھی انجام دیے اور اہم شخصیات مثلاً شہزادوں اور بادشاہوں کو قید خانے میں رکھنے کے لئے نہایت اعتبار والے امور انجام دیے۔اعتبار خان جو پہلے بابر اور ہمایوں کی ملازمت کرتا رہا وہ ایک مرتبہ اکبر کی ماں اور دیگر بیگمات کی حفاظت کرتا ہوا کابل سے ہندوستان لایا۔(40)۔اعتماد خان نے ۱۵۶۵ء میں میاں مبارک شاہ (جو خاندیش کا بادشاہ تھا) کی بیٹی کو بہ حفاظت اکبر کے حرم تک پہنچایا۔(41)۔اعتبار خان جو جہانگیر کا منہ چڑھا مخنث تھا اسے شہزادہ خسرو کی اسیری کے زمانے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ایک اور مخنث امیر کو ایسے ہی خطاب کے ساتھ اورنگ زیب نے شاہجہاں کے ایام قید کا ناظم مقرر کیا۔

ایسے بے ڈھب فرائض کے انجام دینے کے لئے بہت سے خواجہ سراؤں کی ضرورت ہوتی یوں مسلم بادشاہوں کے حرم میں ان کی بہت بڑی تعداد ہونا ضروری تھا۔کسی بھی اہم امیر کی زندگی کی کہانی میں کھوج لگائیں تو وہ بالآخر ایک خواجہ سرا نکلے گا۔لڑکوں اور مردوں کو ہزاروں کی تعداد میں آختہ کیا جاتا تا کہ وہ مسلم شہروں میں خانگی ملازمت کریں اور بنیادی طور پر حرم کے محافظ بنیں اگر چہ بظاہر کوئی ایسا کام نہ تھا جو انہیں نہ سونپا جاتا۔قرون وسطی کے ہندوستان میں متعدد مسلم شہر تھے۔غلاموں کی منڈیاں تھیں اور بیرونی علاقوں میں بھی۔غلاموں اور خواجہ سراؤں کی تجارت باقاعدہ ایک تجارتی سرگرمی تھی۔بہت سے غلام اور خواجہ سراوں کو خطیر قیمت پر دساور سے منگایا جاتا۔(42)۔اور بہت سے اندرون ملک سے حاصل کئے جاتے۔لیکن زیادہ تر خواجہ سرا ایسے غلام ہوتے جنہیں جنگوں میں پکڑ کر آختہ کیا جاتا۔

مردوں کو مخنث بنانے کا رواج بنگال میں ایک عام بات تھی۔''ہندوستان میں'' جیسا کہ جہانگیر نے لکھا ہے ''خاص طور پر سلہٹ کے صوبے میں جو بنگال کا زیر نگیں ہے۔اس خطے کے عوام میں یہ ایک روایت تھی کہ وہ اپنے چند بیٹوں کو مخنث بنا کر صوبہ دار کو مالگذاری (مال واجب) کے عوض دے دیتے ہیں۔۔۔یہی دستور کم و بیش تمام صوبوں میں قبول کیا جا چکا تھا۔اور ہر سال چند بچوں کو اس طرح برباد کیا جاتا تھا کہ وہ توالد وتناسل کے قابل نہ رہتے۔یہ روایت اب مقبول ہو چکی ہے۔(43)۔جہانگیر کے عہد میں بنگال بہت بڑا صوبہ تھا۔شمال کا وسیع پہاڑی سلسلہ، اڑیسہ کی سرکار اور بہار کا بڑا خطہ یہ سب اس میں شامل تھے۔(44)۔اگر خواجہ سرا بنانے کے رواج کو بنگال کے باہر بھی اختیار کر لیا گیا تھا تب یوں لگتا ہے جیسے یہ پوری سلطنت میں پھیل چکا تھا۔جہانگیر نے اس بابت فرامین جاری کئے کہ اس رواج کو نیست و نابود کر دیا جائے مگر نتائج واجبی سے تھے۔لیکن ایسا نظام جس میں مالگذاری مخنثوں کی شکل میں وصول کی جاتی ہو اسے چند احکام کے ذریعے ختم نہیں کیا جا سکتا تھا۔سعید خان چغتائی، جہانگیر کا ایک امیر وہ ۱۲۰۰ خواجہ سراؤں کا مالک تھا۔(45)۔مزید براں مخنث ایک منافع بخش تجارتی مال تھے جیسا کہ ہم غلاموں کی تجارت کے باب میں دیکھیں گے۔ایک خواجہ سرا کی قیمت ایک عام غلام کی قیمت کے مقابلے میں تین گنا ہوتی۔اسی لئے چند علاقے خصوصاً بنگال، دہلی اصفحان اور سمرقند کے بالائی مسلم طبقے کے لئے خواجہ سراوں کی رسد بلا تعطل جاری رکھتے۔(46)۔اورنگ زیب نے بھی ۱۶۶۸ء میں لڑکوں کو خصی بنانے پر پابندی عاید کر دی اور وہ بھی ''پوری سلطنت میں۔''(47)۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے مخنث سازی کی ممانعت کرنے میں جہانگیر کو یہ اندیشہ دامن گیر تھا کہ کہیں مسلم آبادی نہ گھٹ جائے جب کہ اورنگ زیب کے پیچھے مذہبی اغراض کار فرما تھیں۔پھر بھی ان کے

PDF created with pdfFactory trial version www.pdffactory.com

حرم میں کام لیا جائے۔(48)۔اونگ زیب کے عہد میں صرف گولکنڈہ (حیدرآباد) شہر میں پورے سال ۱۶۵۹ء کے دوران کوئی ۲۲۰۰۰ افراد کو خصی کیا گیا۔(49)۔

اتنے بہت سے لڑکوں اور مردوں کو مخنث بنانے اور انہیں کہیں اور سے حاصل کرنے کی ضرورت عیاں ہے۔اتنی بڑی تعداد میں حسین عورتوں کو حرم سرا میں رکھ کر ان کی حفاظت، محافظت اور ان کڑی نگرانی کو محض قلمقانیوں پر نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔اور عام تندرست اور صحتمند مردوں پر حرم کے اندر خدمات انجام دینے کے واسطے اعتبار نہیں کیا جا سکتا تھا جہاں اتنی بہت سی جنس گرسنہ نوجوان عورتیں مقیم ہوں۔(50)۔یوں محفوظ راستہ یہی تھا کہ جن مردوں کو حرم پر پہرہ دینے کے فرائض سونپنا ہوں انہیں بے ضرر بنا دیا جائے۔بادشاہ بھی حرم میں رہتا تھا اور ایسے امرا اور ملازمین جو اس کی خدمت پر متعین ہوں ان کا مخنث ہونا بھی ضروری تھا۔اس نظام میں جو سفا کی سایہ کی طرح لگی تھی اس کی کسی کو فکر نہ تھی کیونکہ یہ زمانہ مطلق العنان حاکمیت والا تھا۔جب کہ دوسری جانب اس میں آقا کی پانچویں انگلیاں گھی میں اور سر کڑھائی میں ہوتا۔ایک مرتبہ اگر کوئی خواجہ سرا بنا دیا جاتا تو اس کی مردانگی بونا جاتی اور خود کو منوا لینے کی صلاحیت برباد ہو جاتی۔اور وہ بالجبر ایک وفادار اور جاں نثار غلام میں ڈھل جاتا۔یہ امر آقا کے لئے کسی اہمیت کا نہ تھا کہ مذکورہ وفاداری اور جاں نثاری کہیں کسی جبر کا ثمر تو نہیں ہے۔یوں مخنث سازی کا سلسلہ مسلم حکمرانی میں جاری وساری رہا۔اگر خواجہ سراؤں یا مخنثوں کو ''دنیا کی سب سے بڑی قابل حصول مسرت سے محروم'' کر دیا گیا ہو۔(51)۔تو ان میں بطور تلافی بہادری کے عظیم کارنامے انجام دینے کی صلاحیت پیدا ہوگئی۔انہوں نے اپنے آقا کے لئے جس عظیم وفاداری کا مظاہرہ کیا یا پھر دولت کے ڈھیر لگا دیئے۔

یہ کسی مورخ کا کام نہیں ہے کہ وہ خواجہ سراؤں پر ترس کھائے یا ان کی مذمت کرے جنہوں نے انہیں خصی کیا تھا۔لیکن وہ نظام کتنا تباہ کن ہوگا جس میں آدمی کا آدمی کسی حد تک استحصال کر سکتا تھا۔یہ ایک جدا بات ہے کہ خواجہ سراؤں نے بہ امر مجبوری ہی سہی اپنے نصیب سے سمجھوتہ کر لیا حالانکہ سفا کی اور جرم اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتا تھا کہ مرد ہی مردوں کو مثلہ کرے اور جنسکاری کی صلاحیت ختم کر دے۔بہت سے لوگوں کو قرون وسطیٰ کے غلام داری نظام کی وجہ سے بہت کچھ جھیلنا پڑا مگر اس میں شبہ نہیں کہ خواجہ سراؤں نے سب سے زیادہ تکلیفیں اٹھائیں۔

PDF created with pdfFactory trial version www.pdffactory.com

باب ۔۱۰

غلاموں کی تجارت

قرون وسطیٰ کی کسی وقایع یا دستاویز میں یہ نہیں ملتا کہ غلاموں کو جنگوں میں کیسے پکڑا جاتا کیسے چھانٹا برایا جاتا تا کہ فروخت کیا جائے، فوج میں بھرتی کرایا جائے۔ شہزادوں اورامرا کو بطور تحفہ دیا جائے یا خانگی خدمات کے لئے الگ کرلیا جائے۔ہمیں جو بھی معلوم ہے وہ یہ ہے کہ غلاموں کو مذکورہ مدات میں کھپا دیا جاتا یا کچھ اور وجوہ بھی ہوسکتی ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے عورتوں کو بردانے کے وقت ان کی شکل وصورت کو اہمیت دی جاتی تھی، جس میں مردوں کی تندرستی اور آقا کا وجدان اس کے ساتھ کوئی مخصوص کام جس کے واسطے غلام کو مناسب سمجھا جاتا۔اس کی ابتدائی مثال تو محمد بن قاسم کے ہاتھوں برہمن آباد کی فتح ہے۔ پکڑے جانے والے اسیران میں سے ایک انتخاب غلاموں اور مال غنیمت میں سے کیا گیا۔'' تا کہ ریاست کا روایتی پانچواں حصہ علیحدہ کرلیا جائے۔منتخب غلاموں کی تعداد لگ بھگ ۲۰۰۰۰ بتائی جاتی ہے باقی ماندہ کو سپاہ میں تقسیم کردیا گیا۔''(1)۔لیکن انتخاب کے لئے کیا پیمانہ یا معیار تھا بیان نہیں کیا گیا۔ایک اور واقعہ امیر تیمور کے متعلق ہے جس نے ۱۳۹۹ء میں ہندوستان پر دھاوا بولا تھا اور بہت بڑی تعداد میں قیدی بنائے تھے۔وہ لکھتا ہے۔''میں نے حکم دیا کہ تمام دستکاروں اور لایق ہنرمندوں کو جو اپنے ہنر میں مہارت رکھتے ہیں انہیں اسیروں میں سے چن کر نکال لیا جائے اور علیحدہ کرلیا جائے اور اس کے مطابق ہزاروں منتخب دستکار میرے احکام کے انتظار میں بیٹھے رہے۔ان سب کو میں نے موجود شہزادوں اور امیروں میں تقسیم کردیا یا ان کو جو میری مملکت کے دوسرے علاقوں میں کارہائے سرکاری میں مصروف تھے۔(تا کہ ان کی دیکھ بھال کریں) میں نے طے کرلیا تھا کہ میں سمرقند میں جامع مسجد تعمیر کراؤں گا جس کی پورے ملک میں کوئی نظیر نہ ہوگی۔ اس لئے میں نے حکم دیا کہ تمام راج اور سنگتراشوں کو میری خصوصی خدمات کے انجام دینے کی خاطر علیحدہ رکھ دیا جائے۔''(2)۔مگر ایسی تفصیلات دیگر واقعات میں میسر نہیں ہیں۔

غلاموں کی خرید وفروخت:

ہندوستانی نژاد غلاموں کی اکثریت ایسے لوگوں پر مشتمل ہوتی جنہیں جنگ میں پکڑا جاتا۔یہی غلام ریاست کی جائیداد اور ملکیت ہوتے۔سندھ پر محمد بن قاسم کی یلغار کے وقت ریاست کا سربراہ خلیفہ تھا اور سندھ میں ہاتھ آنے والے اسیروں کو باقاعدگی سے اسے روانہ کیا جاتا تھا۔کوفی جو چچ نامہ کا مصنف ہے وہ یہ کہنے میں حق بجانب ہے کہ جتنے لوگ ہاتھ آتے ان میں سے ۸۰% تو سپاہ کا حصہ ہوتا، نقدی اور غلاموں کی صورت میں جو بچتا۔۔۔حجاج (گورنر عراق) کو چلا جاتا'' تا کہ وہاں سے آگے خلیفہ کو روانہ کردیا جائے۔ایسی صورت میں اگر مزید غلام درکار ہوتے تو انہیں قیمتاً حاصل کیا جاتا۔محمد بن قاسم جو راجہ داہر کی بیوی لاڈی کو اپنے پاس رکھنے کا متمنی تھا اس سلسلے میں چچ نامہ بڑے وثوق سے کہتا ہے''اس نے مال غنیمت میں سے اسے خرید لیا اس کے بعد اسے بیوی بنالیا۔''(4)۔لیکن اس نے کیا قیمت ادا کی اس کا ذکر نہیں ملتا۔اسی طرح جب حجاج نے ہندوستان میں پکڑے جانے والے ۶۰۰۰۰ غلاموں کو خلیفہ ولید۔اول (۷۰۵۔۷۱۵ء) کو بھیجا تو آخر الذکر نے''ان میں سے چند ایک کنیزوں کو جو شاہی نسل کی تھیں فروخت کردیا'' لیکن یہاں بھی ان کی قیمت بیان نہیں کی گئی۔

غزنی کا محمود اپنی ہر مہم کے بعد اسیروں کی بہت بڑی تعداد ہندوستان سے لے جاتا اور ان میں سے زیادہ تر کو فروخت کردیتا۔ جے پال جو کابل کا شاہیہ شکست خوردہ ہندو بادشاہ تھا اس کی خراسان کی منڈی میں محمود کی ہدایات کے مطابق سرعام نمائش کی گئی جس نے''یہ حکم بھی دیا کہ اسے اسی درہم تاوان کے عوض دیا جاسکتا ہے۔'' ریورٹی اس پر تجویز سی دیتا ہے''لگتا ہے لفظ 'ہزاروں' لکھنے سے رہ گیا۔اگر ایسا نہیں ہے تو محمود نے اپنے اسیر کی کوئی اچھی قیمت نہیں لگائی۔''(6)۔ چونکہ جے پال عمر رسیدہ تھا اس لئے کھلے نیلام میں غالباً اس کے ۸۰ درہم سے زیادہ نہ لگتے۔یا پھر جیسا کہ ہودی والا نے اشارہ کیا ہے کہ جے پال کی عوام کی نظروں میں تضحیک کا بظاہر یہ مقصد تھا۔تا کہ اسے فاتح کے مطالبات کے سامنے جھکایا جاسکے اور وہ اپنی رہائی کو فاتح کی شرائط پر خرید لے۔ جو کچھ یوں مقرر کی گئی تھی''۲۰۰۰۰ طلائی دینار اور ۲۵۰ ہاتھی، علاوہ ازیں جے پال کی گردن میں جو مالا پڑی ہوئی تھی اس کی مزید قیمت ۲۰۰۰۰ طلائی دینار تھی۔''یوں کسی بوڑھے بادشاہ کی قیمت ۸۰ دینار لگنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔

ایک واقعہ ایسا ہے جس میں العتبی ایک خیال پیش کرتا ہے کہ قیدیوں کی فروخت سے کیا یافت ہوتی ہوگی۔اس کے بیان کے مطابق محمود اپنی متھرا، مہابان اور قنوج (۱۰۱۸ء۔۱۰۱۹ء) کی مہم سے واپسی پر غزنی پہنچا اور دیگر مال غنیمت کے علاوہ اس کے ہمراہ ۵۳۰۰۰ اسیران بھی تھے جن میں سے ہر نفس دو سے لے کر دس درہم میں فروخت کیا گیا۔اس بیان سے یہ بہ احتیاط استنباط کیا جاسکتا ہے کہ کم سے کم قیمت جس پر ایک ہندوستانی اسیر بک سکتا تھا دو درہم تھی اور زیادہ سے زیادہ دس درہم۔ہم یہ بھی بات بہ احتیاط ختم کرسکتے ہیں کہ چڑھائی کرنے والے اس لئے غلاموں کو پکڑتے تھے تا کہ انہیں بیچ کر رقم بنائیں۔ کیونکہ عتبی یہ بھی کہتا ہے کہ''مختلف شہروں کے سوداگران انہیں خریدنے آیا کرتے تھے جس سے ماورالنہر عراق اور خراسان جیسے ممالک ان سے بھرے رہتے۔(8)۔اس سے پہلے تھانیشور (۱۰۱۵ء) کی مہم میں بقول فرشتہ''مسلم فوج ۲۰۰۰۰۰ اسیران کو غزنین لائی جس سے دارالحکومت غزنین کوئی ہندوستانی شہر لگتا تھا۔کیونکہ فوج کے ہر سپاہی کے پاس کئی غلام اور کئی کنیزیں تھیں۔(9)۔اسی طرح وادی

PDF created with pdfFactory trial version www.pdffactory.com

تھیں۔

کسی مقام پر قیمت کا بیان بمشکل کافی ہوسکتا ہے جس سے گیارہویں صدی عیسوی کے دساور میں ہندوستانی غلاموں کے بکنے سے کل مالیت کا تخمینہ لگایا جاسکے۔ان دنوں میں دو سے لے کر دس درہم کی کیا قدر مبادلہ تھی یہ بھی نہیں معلوم۔ابوالفضل خلیفہ عمرؓ کے زمانے کے درہم سے اس سکہ کی تاریخ کا سراغ لگاتا ہے لیکن اس کا تفصیلی اور قدرے پیچیدہ بیان تو صرف یہ ظاہر کرتا ہے کہ غزنوی عہد کا ابتدائی درہم غزنی اور لاہور کے ٹکسالوں میں ڈھالا جاتا تھا۔یہ چاندی کا ہوتا اور مختلف اوزان اور قدروں کا ہوتا اور یہی حال دینار کا تھا جو سونے کا بنتا تھا۔(11)۔تاہم ہزاروں غلاموں کی فروخت سے جو ہر مہم کے بعد ہوتی جیسا کہ ان اسیروں کے اعداد وشمار جنہیں محمود اپنے ساتھ لے جاتا ظاہر کرتے ہیں (12) وہ دھاوا بولنے والے کو اچھا منافع دلاتے۔اس میں حیرانی نہ ہونا چاہیے کہ خزانے کے علاوہ یہ بھی دستور تھا کہ پنجاب پر غزنوی تسلط کے زمانے میں اسیروں کو بڑی باقاعدگی سے لے جایا جاتا تھا تاکہ انہیں بیچ کر اضافی رقم حاصل کی جائے۔یہ نفع بخش تجارت جاری رہی اور اسی خاندان کا چشم و چراغ سلطان ابراہیم (۱۰۵۴ء۔۱۰۹۹ء) ایک مرتبہ ایک لاکھ اسیروں کو غزنی لے گیا۔(13)۔

مسلم حکمرانی کے پہلے سو سال میں جس سے مراد ہے ایبک، التمش اور بلبن (۱۲۰۶ء۔۱۲۹۰ء) کے عہد میں دونوں اصناف کے غلاموں کو فوجی مہموں میں جوق در جوق پکڑا جاتا تھا۔لیکن انہیں زیادہ تر بادشاہوں، امرا اور سپاہیوں میں تقسیم کردیا جاتا جنہیں ہمہ اقسام کے فرائض سونپے جاتے۔(14)۔سلطانوں کو بہت بڑی تعداد میں کارکنوں کی ضرورت ہوتی تاکہ وہ جنگلوں کو صاف کریں، سڑکیں بنائیں، بطور امدادی فوج کے کام کریں، عمارتیں تعمیر کریں اور انتظامیہ کے لئے پیغام رسانی کا کام کریں خیمے نصب کریں اور جہاں پڑاؤ ہو وہاں بطور کارکن کام کریں۔غلاموں کی اس لئے بھی ضرورت تھی کہ وہ خانگی ضروریات کی رسد ہر نوعیت کے غیر ملکی مسلمانوں کو بادشاہوں کو اور امرا کو اور عام لوگوں تک پہنچائیں، رہائش کے لئے چھوٹے چھوٹے گھر بنائیں یا پھر عظیم اور پرشکوہ عمارات وغیرہ۔کنیز لڑکیاں بہت بڑی تعداد میں اس لئے درکار تھیں کہ مسرت ونشاط پہنچائیں یا دیگر خدمات۔یہ سارے کام کاج پکڑے جانے اور پھر غلام بن جانے والے انجام دیتے۔یوں لگتا ہے کہ چونکہ ان سب کو مذکورہ کاموں میں لگادیا جاتا تھا اس لئے ان میں سے چند ہی بکنے کے لئے بچتے ہوں گے۔اسی وجہ سے اس دور میں ان کی فروخت کا کوئی خاص ذکر نہیں ملتا۔مگر پکڑے جانے والوں کی فروخت ایک عام چلن تھا۔مثال کے طور پر اس کا ذکر آتا ہے کہ سلطان ناصرالدین محمود ابن التمش (۱۲۴۶ء۔۱۲۶۶ء) کے پاس کوئی بھی ''خرید کردہ'' لونڈی یا خادمہ نہ تھی یعنی کنیز۔اور یہ کہ اس کی بیوی اس کے لئے کھانا پکاتی اور یہ کہ وہ اپنے ذاتی اخراجات کے واسطے قرآن مجید لکھ کر بیچتا۔''یہ کہانی تاہم گھسی پٹی ہوچکی ہے بلاشبہ راورٹی اضافہ کرتا ہے''۔''اتنی گھسی پٹی ہوئی جیسی کہ ابتدائی خلفاء والی'' کیونکہ یہی سلطان اپنے امیر منہاج سراج کو چالیس غلاموں کی نفری اس لئے دیتا ہے کہ وہ اس کی چھتی بہن کو خراسان بھجوادے۔(15)۔

سلطان علاءالدین خلجی کے عہد میں سلطنت بہت مستحکم ہوگئی تھی (۱۲۹۶ء۔۱۳۱۶ء) (16)۔اس نے بہت سی فتوحات کیں اور مہموں میں بہت بڑی تعداد میں غلاموں کو پکڑا گیا۔انہیں مختلف طریقوں سے کھڑے کھڑے بیچا گیا۔(17) دہلی کے بازاروں میں اور دیگر شہروں کے بسا اوقات حملہ آور منگولوں کی عورتوں اور بچوں کو بھی پکڑلیا گیا اور ہندو غلاموں کی طرح دہلی اور ہندوستان کے دوسرے شہروں میں بیچ ڈالا گیا۔(18)۔

ہندوستانی قرون وسطی کی تاریخ میں علاءالدین خلجی کا منڈی پر کنٹرول رکھنا بہت مشہور ہے۔اس نے ہر شئے کی قیمت مقرر کردی غلاموں سمیت۔غلاموں کی قیمت فروخت کچھ یوں تھی۔کسی کام کاج لڑکی کی معیاری قیمت ۵ سے ۱۲ تنکہ تھی اور اگر خوش شکل ہو اور داشتہ بننے کے لائق ہو تو ۲۰ سے ۳۰ تنکہ بلکہ ۴۰ تنکے ہوسکتی تھی۔جب کہ ایک غلام کی قیمت بالعموم ۱۰۰ تا ۲۰۰ تنکے ہوسکتی تھی اور خوبصورت لڑکوں کی قیمت ۲۰ سے ۳۰ تنکہ مقرر تھی اور نگاہ پر نہ چڑھنے والا ۷ تا ۸ تنکوں میں مل سکتا تھا۔غلام بچہ (غلام بچگان، نوکری، کہلاتا) کی قیمت ۷۰ سے ۸۰ تنکے متعین کی گئی تھی۔غلاموں کی درجہ بندی چہرے مہرے اور کام کرنے کی استعداد دیکھ کر ہوتی۔اور جب سودا گر تھوک خریداری کرتے اور قیمت فوراً ادا کرنے پر تیار ہوتے اور جن کے پاس ذرائع ہوتے جو اس ریوڑ کو بیچنے کی غرض سے دوسرے شہروں کو لے جاتے تو قیمتیں بھی ویسی ہی لگتیں۔

ان بکریوں سے کسے منافع ملتا۔اگر علاءالدین خلجی اپنے ہم عصر مغربی ایشیائی ممالک کے حکمرانوں کی تقلید کرتا تو منافع اسے ملتا یعنی سلطان یا پھر حکومت۔جو بھی دستور تھا۔عصامی اپنی تصنیف فتوح السلاطین میں بیان کرتا ہے کہ جب غزنی کے محمود نے ہندوشاہیہ موروثی حکومت کے راجہ جے پال کو شکست دی تو وہ ''اسے غزنی سلطنت کے دور دراز مقام پر لے گیا اور اسے غلاموں کی منڈی کے کسی دلال کے حوالہ کردیا۔۔۔(اور) بادشاہ محمود کے حکم کے مطابق جنہوں نے (منڈی کے دلالوں کو مقیمان بازار کہا جاتا تھا) جے پال کو بطور غلام ۸۰ دیناروں میں فروخت کرکے ہاتھ آنے والی رقم سرکاری خزانہ میں جمع کرادی'' ہودی والا اس پر اضافہ کرتا ہے کہ ''اس سے بہتر مثال کو تلاش کرنا دشوار ہوگا جس میں حکمراں خود منافع خور ہوتا ہے۔''(20)۔قرون وسطی کے چند مغربی ایشیائی ممالک میں ارامارون لاپیڈس کے مطابق حکمرانوں کا دستور تھا کہ وہ پوری تھوک تجارت اپنے ہاتھ میں رکھتے، اجناس اور غالباً دیگر تمام اشیا جس سے ہونے والا تمام منافع انہیں ملتا نہ کہ نجی بیوپاریوں کو۔ابن خلدون بھی یہی کہتا ہے کہ ''بردہ فروش کھیپوں کی صورت میں انہیں مصر لاتے۔۔۔اور سرکاری خریدار ان کی نمائش کا ایسا بندوبست کراتے تاکہ معاینہ ہوسکے۔''ان کی ایسی بولی لگے جس سے ان کی مالیت سے بڑھ کر قیمت لگے۔(21)۔یہ اصول علاءالدین پر بھی پوری طرح منطبق ہوتا ہے۔وہ تمام سوداگروں سے غلاموں کی طرح پیش آتا۔اس کے احکام کے مطابق کسی دلال یا گماشتے کو اس کی اجازت نہ تھی کہ وہ غلاموں کی منڈی میں داخل ہو اور ''مال'' کا معائینہ کرے۔جس سے کاروباریوں کے منافع پر تخفیف ہوجاتی اور سلطان کی یافت میں اضافہ۔اس میں حیران ہونے کی کوئی بات نہیں ہے کہ اس کی موت پر سندھی (ملتانیوں) سوداگروں نے اس لئے جلوس نکالے تاکہ علاءالدین کی موت کا جشن منایا جائے۔(22)۔

مخصوص سودوں میں تمام مقررہ نرخ کے قوانین دھرے کے دھرے رہ جاتے جب بہت بڑی تعداد میں غلام ہاتھ آتے یا پھر غلام بہت حسین ہوتا (مرد یا عورت۔لڑکا یا لڑکی) تو اونچی قیمت لگتی گویا ۱۰۰۰ سے ۲۰۰۰ تنکہ میں منڈی میں لایا جاتا۔جس سے بڑی الٹبیلی صورتحال پیدا ہوجاتی کیونکہ کوئی بھی جرأت نہ پاتا کہ اس غلام یا کنیز کو خرید

PDF created with pdfFactory trial version www.pdffactory.com

جاتا۔شاعر بدر چچ کا دعویٰ ہے کہ اس نے ایک غلام بنام گل چہرہ ۹۰۰ تنکوں کا خرید ا تھا۔(23)۔ ہزار دینار کا خطاب جو ملک کافور کو ملا ظاہر کرتا ہے کہ کسی بھی ہنر مند غلام کی قیمت کچھ بھی لگ سکتی تھی۔ اس لئے ہم بہ اطمینان کہہ سکتے ہیں کہ علاء الدین کے عہد اقتدار کے سوا جب قیمتیں معین تھیں، غلاموں اور داشتاؤں کی قیمتیں غیر یقینی ہوا کرتی تھیں، جو جنگ اور قحط جیسے حالات کی وجہ سے پینگیں لیتیں، فرد کی شکل وصورت، نیلام کنندہ کی مول تول کرنے کی صلاحیت اور کایاں مشتری پر۔(24)۔اور منڈی میں رسد اور طلب کے اصولوں کے زیر اثر بھی قیمتیں ڈانوا ڈول رہتیں۔مثال کے طور پر جب محمد غوری اور قطب الدین ایبک نے مل کر کوہ جڈ (Salt Range) پر چڑھائی کی تو ''بہت سا مال غنیمت ہاتھ آیا اور بہت سے قیدی بنے کہ پانچ ہندو (کھوکھر) اسیروں کو محض ایک دینار میں خرید ا جاسکتا تھا۔''(25)۔قیدیوں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ انہیں دساور روانہ کر دیا گیا۔''تا کہ انہیں جلد ہی خراسان میں فروخت کر دیا جائے۔''(26)۔جب کہ دوسری جانب اگر رسد میں کمی آجاتی اور طلب بے تحاشہ تو قیمتیں آسمان سے باتیں کرنے لگتیں۔سلطان قطب الدین مبارک خلجی (۱۳۱۶ء۔۱۳۲۰ء) کی حکمرانی کے حالات بیان کرتے ہوئے جو علاء الدین کا وارث تخت بیٹا تھا ضیاء الدین برنی کہتا ہے کہ علاء الدین کے نافذ کردہ تمام کڑے قوانین کو نئے سلطان نے گھورے پر پھینکوا دیا اور قطب الدین اور اس کے امرا رنگ رلیوں اور قیود و حدود سے آزاد زندگی گزارنے لگے ان حالات میں ''خوبصورت لڑکیاں اور بے ریش لونڈے ایک نایاب شئے بن گئے اور ان کی قیمتیں چڑھ کر ۵۰۰ اور بسا اوقات ایک ہزار بھی اور دو ہزار تنکہ تک جا پہنچتیں۔(27)۔سو چودہویں صدی عیسوی کے آغاز میں جیسا کہ وقایع نگاروں نے بیان کیا ہے کہ کسی غلام کی کم سے کم قیمت آٹھ تنکہ ہوتی تھی اور زیادہ سے زیادہ ۲۰۰۰ تنکے۔خلجی کے دور میں ہندوستان میں غلام سستے داموں اس لئے ملتے تھے کیونکہ ان کی قیمتیں علاء الدین کے بس میں تھیں اور اس لئے بھی کیوں کہ سکوں کی صورت میں سرمایے کی رسد کم تھی۔اس لئے ضیاء الدین برنی لکھتا ہے ''ایک اونٹ آپ ایک دنگ (چھوٹا کانسے کا سکہ) میں خرید سکتے ہیں لیکن دنگ کہاں سے آئے۔''(28)۔یہ دیکھتے ہوئے لگتا ہے جیسے وہاں مال کے بدلے مال کا بھی رواج ہوگا۔

کم قیمت ہندوستانی غلام:

ضیاء الدین برنی ''گھوڑوں، غلاموں اور چوپایوں'' کی فروخت کے ضوابط کو ایک ہی ذیل میں شمار کرتا ہے۔ٹی پی ہیوز ہدایہ کا حوالہ دیتے ہوئے کہتا ہے کہ غلاموں کو چاہے وہ مرد ہوں یا عورتیں محض تجارتی مال سمجھا جاتا اور ''انہیں ضابطوں کا دونوں یعنی حیوانات اور غلاموں کی خرید وفروخت پر اطلاق ہوتا۔''(29)۔ایک دودھ دینے والی بھینس کی قیمت ۱۰۔۱۲ تنکہ ہوتی اور کام کا جولڑ کی سستی ملتی۔اچھی نسل کے گھوڑے کی قیمت ۹۰۔۱۲۰ تنکے ہوتی، اور ایک غلام اوسطا ۱۰۰ کا آجاتا۔کوئی خوش شکل مرد یا لڑکا ۲۰ سے ۳۰ تنکے کا آجاتا۔(30)۔اس لئے ہم اس پر اطمینان کا سانس لے سکتے ہیں کہ خلجیوں کے عہد میں انسانوں کی قدر کم از کم گھوڑوں اور بھینسوں سے کم نہ تھی۔

عصری وقایع نویس برنی بڑے فخر سے کہتا ہے کہ اشیاء کی ارزاں قیمتیں علاء الدین کے زمانے کے بعد پھر دیکھنے میں نہ آئیں۔(31)۔لیکن قیمتیں کم ہونے کا رجحان ہمہ گیر تھا اور مدید مدت تک پھیلا رہا۔سلطان محمد بن تغلق (۱۳۲۵ء۔۱۳۵۱ء) کے ایام حکمرانی کے متعلق لکھتے ہوئے شہاب الدین العمری رقمطراز ہے ''سلطان کبھی بھی کفار کے خلاف جنگ کرنے کے عزائم اور جوش وخروش کے اظہار میں کمی یا عدم دلچسپی نہ جھلکنے دیتا۔۔۔روزانہ ہزاروں غلام نہایت معمولی قیمت پر فروخت کئے جاتے کیونکہ اسیروں کی تعداد ان سے بڑھ کر ہے۔۔۔(کہ) دہلی میں ایک نوجوان لڑکی کی مالیت برائے امور خانہ داری آٹھ تنکوں سے اوپر نہیں جاتی۔اور ایسی جو ہر دو کردار یعنی خانگی ملازمہ اور داشتہ کے فرائض ادا کرنے کے لئے مناسب ہو وہ پندرہ تنکوں میں بکتی ہے۔دسرے شہروں میں تو قیمتیں اس سے بھی کم ہیں۔۔۔غالباً یہی وجہ تھی کہ جب ابن بطوطہ بنگال میں تھا تو کہتا ہے کہ ایک حسین کنیز کو وہاں ایک طلائی دینار (یا دس تنکے) میں حاصل کیا جاسکتا تھا۔''میں نے اسی قیمت پر ایک نہایت حسین کنیز لڑکی خریدی جس کا نام عاشورہ تھا۔میرا ایک دوست بھی ایک خوبصورت غلام لڑکی دو طلائی سکوں میں خرید لایا جس کا نام لولو تھا۔(32)۔یہ بہت دشوار ہے کہ دہلی کی منڈی اور دیگر صوبوں کے بازاروں کی قیمتوں میں کوئی تعلق تلاش کیا جاسکے۔عمری مزید کہتا ہے ''مگر پھر بھی غلاموں کی قیمتیں کم ہونے کے باوجود ۲۰۰۰۰ تنکہ بلکہ اس سے بھی زیادہ ہندوستانی لڑکیوں کی قیمت لگ جاتی ہے۔میں نے وجہ جاننا چاہی۔۔۔جس پر مجھے بتایا گیا کہ یہ جوان لڑکیاں اپنے حسن کی وجہ سے نمایاں ہیں اور ان کے آداب واطوار دلآویز ہوتے ہیں۔(33)۔

نوجوان غلاموں کی قیمتوں کی ارزانی کو ابن بطوطہ نے بالواسطہ تصدیق کی ہے۔ان کا ایسا تانتا بندھا رہتا تھا کہ ایک جگہ وہ لکھتا ہے ''ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ دہلی میں چند کافرہ قیدیوں کی آمد ہوئی جن میں سے دس کو وزیر نے مجھے بھیجا۔۔۔میرے دوست نے تین نوجوان لڑکیاں مانگ لیں، ان میں سے ایک کو میں نے اس شخص کو دے دیا جو انہیں لایا تھا۔۔۔اور مجھے نہیں معلوم باقی ماندہ کا کیا ہوا۔''(34)۔فیروز تغلق کی سالانہ چھوٹی لڑائیوں میں ہزاروں غلاموں کو پکڑا جاتا اور ظاہر ہے انہیں بیچ ڈالا جاتا کیونکہ عصری وقائع نویس شمس سراج عفیف یہ کہتا ہے کہ ''جن جگہوں کی غارت گری کی جاتی اور لوٹا جاتا وہیں پر قیدیوں کو شاہی ضابطوں کے مطابق ٹھہرایا جاتا۔جو شاہی خدمات کے لئے مناسب پائے جاتے تو انہیں دربار کی جانب روانہ کر دیا جاتا۔''(35)۔بچ جانے والوں کو فروخت کر دیا جاتا۔اسی نظام کے تحت یہ بھی ممکن تھا کہ فیروز کے ایک غلام بشیر سلطانی میں اتنی استطاعت پیدا ہوگئی تھی کہ اس نے ۴۰۰۰ غلاموں (مال خریدا) کو ذاتی خدمت کے واسطے خرید لیا۔(36)۔

پندرہویں صدی اور بعد میں ہمیں ایسی مزید اطلاعات ملتی ہیں جن سے غلاموں کی فروخت اور ان کی اندرون ملک اور دساور میں قیمتوں کا پتہ چلتا ہے۔اپنی یادداشتوں میں بابر لکھتا ہے کہ ''ہندوستان اور خراسان کی تجارتی شاہراہ پر دو تجارتی بازار واقع ہیں۔ایک کابل ہے اور دوسرا قندھار (کابل کو راستہ لاہور سے جاتا اور قندھار کے لئے ملتان سے)۔۔۔ہر برس کابل سے۔۔۔ہندوستان کے لئے کارواں چلا کرتے۔۔۔جو غلاموں (بردہ) کو لایا کرتے۔''اور دیگر اشیائے تجارت اور انہیں بڑے منافع پر فروخت کرتے۔''کابل میں خراسان، روم (ترکی) عراق اور چن (چین) کا مال مل سکتا تھا۔جب کہ یہ ہندوستان کی اپنی منڈی ہے (بہ اصرار)'' جہاں پر جہاں تک غلاموں کو ٹھکانے لگانے کا تعلق تھا مال کے بدلے مال کا رواج تھا۔بطور مثال ولیم فنچ ۱۶۱۰ء میں آگرہ میں بیٹھ کر لکھتا ہے اور کہتا ہے ''جنگل میں انسانوں کو اسی طرح

PDF created with pdfFactory trial version www.pdffactory.com

کابل روانہ کر دیتا تا کہ ان کے عوض گھوڑے اور کتے حاصل کئے جائیں۔ یہ بات توفیخ کے علاوہ دیگر لکھنے والوں نے بھی بتائی ہے۔(37)۔ مال کے بدلے مال کی تجارت کا رواج نہ صرف جہانگیر کے دورِ حکومت میں پھل پھول رہا تھا بلکہ یہ تو پورے قرون وسطیٰ کا رواج تھا۔

آ ئین اکبری اور دیگر تصنیفات ملازمین اور مزدوروں کو ملنے والی اجرت کی تفصیلات دیتی ہیں۔ مال کار بالواسطہ یہ غلاموں کی قیمت منڈی میں لائے جانے والی دیگر اشیائے تجارت کی طرح دیتی ہیں۔ ڈبلیو ایچ مورلینڈ نے یہ نتیجہ نکالا کہ کچھ لوگ جنہیں مختلف کاموں پر لگایا جاتا تھا وہ آزاد لوگ ہوتے مگر باقی غلام ہوتے، لیکن جو وظائف انجام دینے کے لئے دونوں طبقات کو دیئے جاتے بڑی حد تک ان کا ادل بدل کیا جا سکتا تھا، اس لئے ہمارے مقصد کے لئے مناسب ہوگا کہ ہم انہیں ایک ہی طبقہ مان لیں اور غلاموں کی قیمت کا تخمینہ اس بنیاد پر لگایا جائے کہ مزدور کو کیا اجرت ملا کرتی تھی۔ مغل ہندوستان میں اور اکبر کے عہد میں (سولھویں صدی) اور جیسا کہ بغ نی آ غ (سولھویں صدی) نے دیکھا ''عام آزاد شہری کو اتنی اجرت پر رکھا جاتا جو کسی کے جسم اور روح کا رشتہ برقرار رکھنے سے ذرا سی زیادہ ہوتی۔۔۔ ایک ملازم جو کسی خصوصی تربیت کا حامل نہ ہوتا وہ اکبر کے دربار میں ڈیڑھ روپیہ ماہانہ میں پڑتا اور شاید مغربی ساحل پر دو روپیہ ماہانہ پر۔۔۔ پایرارڈ گوا میں ایک کنیز کی قیمت ۵۰ روپے کے برابر بتاتا ہے جو ایسی اشیائے تجارت کی ایک بڑی مصروف منڈی تھا۔ لیکن یہ بھی لازم ہے کہ نرخوں کی حد میں بہت فرق رہتا ہوگا جس کا دارومدار جزوی طور پر فرد کے اوصاف پر اور جزواً مال کی رسد میں کمی وبیشی پر۔(38)۔ انگریز اوسطاً ۴۰ سے ۵۰ روپے ایک غلام کی قیمت ادا کرتے۔ ''ابتدائی حوالوں سے پتہ چلتا ہے کہ ولندیزیوں کی طلب نے قیمتوں میں اضافہ کر دیا۔ جو بالعموم ۱۵ سے ۲۰ روپے تھا۔''(39)۔ عام آدمی کی اجرت یعنی مزدور نہ کہ غلام کی بھی ایسی ہی کم تھی۔ لیکن غلاموں کا تناسب جو ملکیت کے دائرے میں آتے تھے ان کا ملازموں کے مقابلے میں زیادہ خیال کیا جاتا تھا جنہیں اخراجات کی مد میں شمار کیا جاتا۔ اس میں حکمرانوں، امراء، بیوپاریوں اور صنعت کاروں کے لئے یہ کہیں زیادہ سود مند تھا کہ وہ محنت کشوں کو اجرت پر رکھنے کے بجائے خرید لیں۔ دیہی علاقوں میں غلاموں سے کام لینا کہیں زیادہ ارزاں پڑتا جو زراعت کے پیشے کے لئے نہایت جفاکش ثابت ہوتے۔ لیکن قرون وسطیٰ میں غلامی شہری خدمات کے لئے زیادہ درکار تھی۔ اس لئے دیہی آبادی کو اسیر بنا کر شہروں میں کام کرنے کے لئے لایا جاتا۔ دیہی غلاموں اور ملازموں کو منڈی میں سے نہ خریدا جاتا بلکہ ان کی دستیابی ان ہی کے توالد وتناسل سے ہوتی۔ جس سے آبادی میں اضافہ ہوتا رہتا۔ شہروں میں تو ویسے ہی ان کی کوئی قلت نہ ہوتی۔ پلسیارٹ اور متعدد دیگر غیر ملکیوں نے ذکر کیا ہے کہ لوگ بازار میں مزدور حاصل کرنے والوں کے انتظار میں کھڑے رہتے تا کہ کوئی انہیں پوچھے اور ''زیادہ تر بڑے بڑے جاگیرداروں کا وطیرہ تھا کہ وہ مہینہ ۴۰ دن کا شمار کرتے اور اس مدت کے انہیں ۳ یا ۴ روپے دیتے۔''(40)۔ ''اکبر نے مندرجہ ذیل یومیہ اجرت کارکنوں اور کاریگروں کی مقرر کی۔ ۲ دام (تانبے کا سکہ، روپیہ = ۱۴۰ کا) یہ عام مزدور کے اجرت ہوتی، ۳ سے ۴ دام کاریگروں کے لئے، ۳ سے ۷ دام بڑھئی کے واسطے اور ۵ سے ۷ دام راج کے لئے۔''(41)۔ متعدد مواقع میں سب سے نچلے درجہ کا ملازم دو روپے ماہانہ سے بھی کم کا حقدار ہوتا۔ '' جبکہ جسمانی مشقت کرنے والوں کی اکثریت اور پیادہ سپاہی اپنی ملازمت ۳ روپے مہینے سے بھی کم پر شروع کرتے۔۔۔ ادنیٰ گزر اوقات کے لئے دربار کے غلام کو کم سے کم ایک دام یومیہ ملتا جو سکہ رائج الوقت کے تین چوتھائی روپے (آج کی زبان میں ۷۵ پیسے) ماہانہ کے مساوی ہوتا۔۔۔ یہ مثالیں ان نتائج کو لگتا ہے حق بجانب ٹھہراتی ہیں کہ سترہویں صدی میں غیر ملکیوں کو یہ آسانی لائق ملازم لگ بھگ تین روپے ماہانہ میں مل جاتے۔ اس سے حقیقی اجرتوں کی مالیت کا ماجرا تو نہیں کھلتا (لیکن) مذکورہ نرخوں نے فرنگیوں کو حیران کر دیا جنہیں یہ انتہائی کم لگے۔۔۔(42)۔

مزدوروں کی اجرتوں سے یہی ناگریز نتیجہ نکلتا ہے اور اسے اگر غلاموں کی قیمتوں پر منطبق کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہمہ وقت بہت کم رہے۔ غلاموں کی اصل قیمت کے متعلق کما حقہ حوالہ جات نہیں ملتے اس لئے ہم اس باب کو اس اطلاع کے ساتھ بند کرتے ہیں کہ ماہ نومبر (۱۹۴۷ء) میں ہندو اور سکھ لڑکیاں جنہیں کشمیر پر پٹھان چڑھائی کرنے والے اپنے ساتھ لے گئے انہیں غلاموں کے بازاروں میں بیچا گیا۔(43)۔ ان کی قیمت کم وبیش دس روپیہ فی کس ہوتی کیونکہ یہ تقسیم ہند کا ابتدائی زمانہ تھا یعنی (۱۹۴۷ء۔۱۹۴۸ء)۔

غیر ملکی غلاموں کی درآمد:

ہندو غلاموں کے مقابلے میں جنہیں اکثر پکڑ کر غولوں کی شکل میں فروخت کر دیا جاتا غیر ملکی غلاموں کی قیمت اونچی ہوا کرتی انہیں ہمیشہ زیادہ باصلاحیت سمجھا جاتا اور بسا اوقات لازماً انہیں اشیائے تعیش میں شمار کیا جاتا۔ غیر ملکی غلاموں کو ان بردہ فروشوں سے خریدا جاتا جو دریائے سندھ پار کے دور دراز خطوں سے آ رہے ہوں۔ اور ایک غلام کی قیمت بڑھ کر ۵۰۰ سے ۱۰۰۰ دینار تک ہوتی۔ دونوں کتابوں ہدایہ اور فتاویٰ عالمگیری میں ایک غلام کی قیمت بہ تکرار درج ہے اگرچہ مثالوں کی شکل میں جو زیادہ تر ۱۰۰ درہم بیان کی گئی ہے۔(44)۔ مثال کے طور پر قطب الدین ایبک نے دو اعلیٰ تربیت یافتہ ترک غلام ایک لاکھ جتل یا ۲۰۰۰ تنکہ میں خریدے تھے (تانبے کے ۴۸۔۵۰ جتل چاندی کے ایک تنکہ کے مساوی)۔

اسی طرح التمش نے قمرالدین تیمور خان کو ۵۰۰۰۰ جتل یا ۱۰۰۰ تنکہ میں خریدا تھا۔(45)۔ اور یہ سودا بڑے بھاؤ تاؤ اور مول تول کے بعد پٹا تھا۔ اس سلسلے میں التمش کی قطب الدین ایبک کے ہاتھوں فروخت کا ماجرا ایک دلچسپ اور سبق آموز قصہ ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے دیکھ آئے ہیں کہ ایک بردہ فروش جمال الدین محمد، التمش کو غزنی سے لا چکا تھا تا کہ اسے سلطان معزالدین کو فروخت کر دے۔ ''اس زمانے میں کوئی بھی ترک غلام اس سے زیادہ خوش اندام اعلیٰ اوصاف، ذہانت اور ذکاوت کا حامل دارالحکومت میں نہیں لایا گیا تھا۔'' سلطان نے اس کی قیمت پوچھی، سوداگروں یا ان کے گماشتوں نے جو قیمت بتائی وہ دو غلاموں کی تھی۔ ایک التمش دوسرا ایباک جو کہ ''فی کس خالص رکنی سونے کے کل ایک ہزار دینار بنتی ہے۔'' لیکن سوداگر جمال الدین محمد نے اس رقم میں شمس الدین کو بیچنے سے انکار کر دیا۔ جس پر سلطان نے برہم ہو کر حکم دیا کہ کوئی انہیں نہ خریدے اور ان کی فروخت کی ممانعت کرا دی۔

جس پر جمال الدین محمد، التمش کو واپس بخارا لے گیا جو قرون وسطیٰ میں غلام تجارت کا مشہور مرکز تھا۔(46)۔ جب وہ چار یا پانچ سال کے بعد غزنی لوٹا تو قطب

PDF created with pdfFactory trial version www.pdffactory.com

غزنین میں خریدا نہ جائے ،اس لئے اسے دہلی لے جانے دو جہاں اسے خرید جاسکتا ہے۔'' تاجر اس کے مطابق اسے دہلی لے آیا یوں التمش اور دیگر غلاموں کو ایبک نے ایک لاکھ جتل میں خرید لیا۔(47)۔

پھٹکر معاملات میں مول تول اور بھاؤ تاؤ ممکن ہوسکتا تھا۔مگر تھوک خریداری میں پوری کھیپ کی یکمشت قیمت طے ہوتی۔ترکی، شام ایران اور ماوراء النہر کے سوداگران اپنی کھیپوں کے ساتھ مسلم بادشاہوں سے رابطہ کرنے کے عادی تھے۔(48)۔بدیسی غلاموں کی ہندوستان میں بڑی طلب تھی۔مردوں کی تو سخت جسمانی مشقت کے لئے ضرورت ہوتی اور عورتیں داشتہ بنانے اور حرم کے مکینوں پر نظر رکھنے کی خاطر۔نکولائی مانکسی لکھتا ہے کہ جب ۱۶۶۱ء۔۱۶۶۲ء میں شاہ بلخ نے سفارت بھیجی ''تو سفیر اپنے ہمراہ متعدد تاتار اور ازبک خواتین برائے فروخت لایا۔ان میں سے چند ایک کو اورنگ زیب نے خرید لیا۔انہیں لاتعداد کاشغری، قلماقی، پٹھان اور ابی سینائی عورتوں کے ساتھ رکھا گیا۔ان کے انتخاب کی وجہ یہ تھی کہ وہ جسمانی لحاظ سے جنگجو اور نیزے بازی، تیراندازی اور شمشیر زنی میں مہارت رکھتی تھیں۔(49)۔اور اس لئے وہ حرم کی جانفشانی سے حفاظت کرسکتی تھیں۔داشتہ گیری کے واسطے مشرقی یورپ کے ممالک کی صاف رنگت والی عورتوں کو ترجیح دی جاتی۔مثلاً اودے پوری محل نامی اورنگ زیب کی داشتہ جیارجیا کی داہ یا کنیز تھی۔

غیر ملکی غلاموں کی درآمد اٹھارویں صدی تک چلتی رہی۔پندرہویں صدی میں عثمانیوں نے جب قسطنطنیہ پر ۱۴۵۳ء میں قبضہ کرلیا جس سے کرایمیا، بلقان اور مغربی ایشیا کے وسیع چراگاہوں سے جو غلاموں کی ریل پیل تھی وہ مسلم منڈیوں کی جانب مڑگئی۔بعدازاں روس کی جنوب کی جانب توسیع جو اپنی انتہا کو ۱۷۸۳ء میں اس وقت پہنچی جب کرایمیا کو بھی شامل کرلیا گیا، جس سے مسلم ممالک کے لئے سفید فام غلاموں کی ترسیل بتدریج بند ہوکر رہ گئی۔کیونکہ اب افریقہ اور غلامی ہم نام ہوچکے تھے دنیا نے اس بے تابی کو فراموش کردیا۔جس سے تاتار اور بحراسود کے لوگ لاکھوں اہل یوکرین جیارجیا، سرکاسیا، آرمینیا، اہل بلغاریہ اور ترکوں کو فروخت کیا کرتے تھے۔(50)۔انیسویں صدی کے افریقہ میں خطہ سوڈان میں ایسے فارم پائے جاتے تھے جہاں سیاہ فام غلاموں کی چوپایوں اور بھیڑوں کی طرح نسل کشی اور پرورش کی مہارت رکھتے اور بعدازاں انہیں فروخت کردیا جاتا۔بالائی مصر کے دیگر سوداگروں نے خوب فصل کاٹی اور اس طرح بہت منافع کمایا کہ وہ نابالغ لڑکوں کو کوئی تین سو پیاستراز (مغربی وسطی کے ممالک میں ماضی میں رائج چھوٹا سکہ) فی کس خریدتے انہیں قبطی راہبوں سے خصی کرواتے پھر ان مخنثوں کو فی کس ایک ہزار پیاستراز میں بیچ ڈالتے۔مسلم تہذیب نے فی الواقع غلاموں کو خصی کرانے کا کام اس طرح انجام دیا جس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔افریقہ میں بہت سے شہر ایسے تھے جہاں ہیجڑے بنانے کے کارخانے تھے۔یہ بیش قیمت اشیائے تجارت تھی کیونکہ ان کی جراحی میں ۲۵ فیصد کشتگان جانبر ہو پاتے۔(52)مختصراً سیاہ فام ہوں یا سفید فام خصی کئے ہوئے یا دیگر غیر ملکی غلاموں کی قیمت فروتر ہوتی کیونکہ دیگر عوامل کے علاوہ اس میں اخراجات حمل ونقل بھی شامل ہوجاتے۔

غلامی کو رسول محمدؐ نے بھی تسلیم کیا تھا۔اسلام میں ان کا وجود قانون کے مطابق تھا۔غلاموں کی باقاعدہ تجارت کا آغاز اموی خلافت میں شروع ہوا۔(53)۔عباسی خلفاء کے دور میں اس میں وسعت کے علاوہ تیزی بھی آئی۔غلامی کی تجارت مسلم دورحکومت میں اس رفتار سے پھیلی کہ کوئی بھی غلامی کے شکنجے میں آجانے سے محفوظ نہ تھا۔سفید اور سیاہ فام غلاموں کی تجارت پوری مسلم دنیا میں جاری تھی۔'' حدود عالم (دسویں صدی کے ایک فارسی دستاویز کے مطابق) میں لکھا ہے کہ سوڈان (خطہ ارض جو صحرا کے جنوب میں اسے مغرب سے جدا کرتا ہے) کچھ یوں ہے کوئی بھی خطہ اس علاقے سے زیادہ آبادی کا حامل نہیں ہے۔سوداگران وہاں سے بچوں کو چراتے ہیں اور لے بھاگتے ہیں۔وہ انہیں خصی کرتے ہیں پھر انہیں مصر لے جاتے ہیں جہاں انہیں فروخت کردیتے ہیں۔ان میں (سوڈانی) ایسے لوگ بھی ہیں جو ایک دوسرے کے بچوں کو چرا لیتے ہیں تا کہ وہاں کا پھیرا لگانے والے سوداگروں کو بیچ سکیں۔''(54)۔ترک، حبشی، اہل ایتھوپیا، ابی سینیا والے، بربر، اہل سلاؤ اور بہت سی قوموں والے ''ہزاروں'' کی تعداد میں بکتے۔کالے غلاموں کے مقابلے میں سفید فام مہنگے ہوتے۔مصر اور شام ان کی بہت بڑی تعداد مہیا کرتے اور اطالوی بندرگاہیں برآمد کے لئے عارضی گزرگاہوں کا کام انجام دیتیں۔دسویں صدی عیسوی میں سب سے قیمتی سامان تجارت جو وولگا سے وسطی ایشیا پہنچایا جاتا وہ غلاموں کے غول ہوتے وہ پہلے آمو دریا کے علاقے میں لائے جاتے خاص طور سے ثمرقند میں وہاں انہیں فروخت کے لئے بازار میں رکھا جاتا۔(55)۔یہ تجارت نہایت منافع بخش تھی۔

ٹی۔ڈبلیو۔آرنلڈ نے مشرقی یورپین اور افریقی ممالک کے متعلق جو مشاہدات بیان کئے ہیں وہ ہندستان کے سیاق میں برمحل ہیں۔وہ لکھتا ہے'' اگرچہ بہت سے مسیحی قیدیوں کی حالت نہایت ترس کھانے والی تھی، دیگر جو لوگوں کے گھروں میں خانہ دار ملازموں کی خدمات انجام دیتے ان کی بھی حالت یورپ بھر کے گھریلو ملازمین سے گئی گزری تھی۔چونکہ یہ مسلم قانون کے تحت منظم تھی اس لئے غلامی اپنے درشت عیوب سے نجات پاچکی تھی۔نہ ہی ترکی میں وہ بربریت اور وحشیانہ پن پایا جاتا تھا جس کا شمالی افریقہ کے بحری قذاق ممالک میں دور دورہ تھا۔مسیحی قیدیوں کے حالات فطرتاً ان کی صلاحیتوں سے مناسبت رکھتے کہ آیا وہ جفاکشی کی زندگی سے کتنی مطابقت پیدا کرلیتے ہیں جیسے عمر رسیدہ، پادری اور راہبان اور وہ لوگ جو شریف خاندانوں کے لوگ ہوتے انہیں سب سے زیادہ مصائب جھیلنا پڑتے۔جب کہ اطباء اور دستکاروں کا ان کے آقا زیادہ خیال رکھتے کیونکہ ملازموں کی حیثیت میں ان پر خرچ کی جانے والی رقم سے زیادہ یافت ہوجاتی۔کشتی کھینے والے غلاموں کو فطرتاً سب سے زیادہ جھیلنا پڑا۔'' مشرقی افریقہ میں عربوں نے ''خود کو تجارت یا پھر غلاموں کو شکار کرنے کے لئے وقف کردیا تھا۔۔۔فطری بات تھی کہ سرداروں اور لوگوں کے احساسات مسلموں کے لئے جارحانہ تھے جن سے نفرت کی جاتی یا لوگ اس لئے ڈرتے کہ یہ غلاموں کے سوداگر ہیں۔(56)۔دوسری جانب جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے غلاموں کو پرتشدد حربوں سے چرایا جاتا پھر اس کے بعد انہیں اشیائے تجارت میں ڈھالا جاتا۔'' غلام ایک نہایت اساسی نوعیت کی جائیداد تھی۔''(57)۔

غلاموں کی تجارت دونوں راستوں یعنی خشکی اور بحری راستوں کے ذریعے جاری رہی۔غلاموں کی افریقہ اور مغربی ایشیاء سے درآمد واقعی اہمیت کی حامل تھی۔'' سن ۱۵۰۰ء سے پہلے کی صدیوں میں عربوں اور اہل فارس کو موزنبق سے لے کر بنائے ملاکا تک واقع بحر ہند کے بحری راستوں پر غلاموں کی تجارت میں بالادستی حاصل تھی۔(58)۔ان کی ہندوستان کے دونوں جانب کے ساحلوں پر بندرگاہوں والی کوٹھیاں تھیں اور تقریباً ہر ہندوستانی بندرگاہ پر ہمیں مسلمان ملتے ہیں۔جن چیزوں کی وہ تجارت

PDF created with pdfFactory trial version www.pdffactory.com

تھا۔ ہندوستانی سلاطین پورے قرون وسطیٰ میں غلاموں کو متعدد شعبوں کے واسطے درآمد کرتے رہے بالخصوص انتظامیہ اور فوج کے لئے جس سے ان کی بادشاہت کو مقبول مقامی شورشوں سے نجات ملا کرتی۔ کیونکہ جیسا کہ مورلینڈ کا کہنا ہے ''اکبر کا دربار اپنی ہیت میں لازماً غیر ملکی تھا اور آخری زمانے میں بھی مقامی عنصر چاہے ہندو ہوں یا مسلمان پوری انتظامیہ کا نسبتاً چھوٹا سا حصہ تھا۔'' (59)۔ اہل ابی سینیا کی اتنی زیادہ طلب تھی جن کے متعلق ہم تواتر سے عصری وقایع میں پڑھتے ہیں۔ اہل موزنبق کی باقاعدہ آوا جائی لگی رہتی اس کے علاوہ فارس سے اور اس کے پرے واقع ممالک سے بھی درآمدی تجارت جاری رہتی۔ نہ صرف دہلی کے سلاطین بلکہ مغل شہنشاہ بلکہ دکن کی ریاستوں کے سلطان بھی غلاموں کو درآمد کر کے اپنی حکمرانی کو مستحکم رکھتے۔ گولکنڈہ گوا کی تین عظیم بندرگاہوں سے منسلک تھا۔ سورت مغربی ساحل پر اور مسولی پٹم مشرقی ساحل پر۔ (60)۔

جہاں تک شمالی ہند کا تعلق ہے تو بری راستہ بھی اتنا ہی اہم تھا چاہے زیادہ نہ ہو۔ قرون وسطی کے تمام اہم شہروں میں غلاموں کی منڈیاں ہوتیں۔ یہ مناسب ہوگا کہ ہم یاد کریں کہ سبکتگین کو الپتگین نے بخارا میں خریدا تھا اور قطب الدین ایبک کو نیشاپور کے بردہ بازار سے قاضی عبدالعزیز کوفی نے خرید کیا تھا۔ دہلی اور آگرہ کے تمام حکمران غیر ملکی غلاموں کو درآمد کرتے رہتے۔ سلطان شمس الدین التمش نے ایک سوداگر کو ثمر قند، بخارا اور ترمیز روانہ کیا تاکہ وہاں سے غلاموں کو لے آئے۔ تاجر نے سلطان کے واسطے سو غلام خریدے جن میں سے ایک بلبن تھا۔ چینی تاجر بھی ایک مرتبہ چالیس غلام لائے اور انہیں سلطان کی خدمت میں پیش کیا۔ شمسی غلاموں کو جو فہرست منہاج سراج نے دی ہے ان میں سے زیادہ تر خرید شدہ غلام تھے۔ (61)۔

مسلمانوں نے ہندوستان میں غلاموں کی تجارت کے لئے متعدد مراکز قائم کئے۔ دہلی کے علاوہ بنگال کے شہروں مین ان میں بدایوں اتر پردیش میں اور مندر راجستھان میں لیکن یہ بھی دقائع کے بیانوں سے بلاشبہ واضح ہوتا ہے کہ غلام منڈیاں ملک کے تمام اہم مقامات پر وجود رکھتی تھیں کیونکہ یہ بڑے شہروں میں لگنے والے میلوں میں بھی بکتے تھے اور اس غیر انسانی دھندے میں ہندوؤں کو کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اول وجہ تو یہ تھی کہ وہ خود ہی ناگوار بات کا ہدف تھے اور شکار بھی۔ دوم یہ جیسا کہ مورلینڈ نے اشارہ کیا ہے ''ہم چاہیں تو ڈیلا ویل کے بیان سے استنباط کر سکتے ہیں کہ سورت کے ہندو سیٹھ۔ جن سے زیادہ منسکر المزاج لوگ شاید ہی دنیا میں پائے گئے ہوں، وہ غلامی کو یکسر ناپسند کرتے تھے۔''

اب چند ہی لوگ ہوں گے جو گجراتی تاجروں سے بہتر ہوں۔ اگر وہ غلاموں کی تجارت میں ہاتھ ڈالتے تو وہ اس میں چھا گئے ہوتے۔ لیکن غلاموں کو پکڑنا اور ان کے بیچنے کی ہندو نفسیات میں گنجائش نہیں ہے۔ اگرچہ ڈیلا ویل کے بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے مورلینڈ کہتا ہے ''میرے خیال میں یہ تبصرہ تمام ہندوؤں پر منطبق نہیں ہوتا۔۔۔ حالانکہ اکبر کے عہد میں اس کلیے کو تمام ہندوؤں کی حمایت حاصل نہیں تھی۔۔۔ غلامی کے وجود کی تصدیق کئی سیاحوں نے کی ہے جیسے عبدالرزاق، کونٹی اور باربوسا (63)۔'' احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ ہم یہ تسلیم کرلیں کہ اس کا رواج دکن میں بھی تھا جب کہ یہ ملک کے شمالی علاقوں میں بھی حاوی ہوتا گیا جب دکن کی خاندانی سلطنتیں نمودار ہوئیں اور ہم نکیتن کے بیان پر بھی یقین کر سکتے ہیں کہ اس کے زمانے میں بیدر کے ''کالے لوگوں'' میں بھی اس کی تجارت ہوتی تھی۔ (64)۔ لیکن اس کی ساری تجارت مسلمانوں کے ہاتھ میں تھی نہ کہ ہندوؤں کے کیونکہ مورلینڈ یہ اضافہ کرتا ہے کہ ۱۶۴۳ء میں ''ایک نایک یا سردار نے ایک ولندیزی درخواست کو جس میں اس کی اجازت طلب کی گئی تھی کہ انہیں ۱۰۰۰ غلام تک سالانہ خریدنے دیئے جائیں اس بنیاد پر مسترد کر دیا تھا کہ نہ صرف یہ باعث رسوائی ہوگا بلکہ یہ گناہ بھی ہے۔ (65)۔ تمام روایات اس حقیقت کی جانب اشارہ کرتی ہیں کہ ہندو اگرچہ پوری ہندوستانی تاریخ میں بڑے تاجر اور بیوپاری رہے ہیں مگر انہوں نے کبھی بھی غلاموں کی تجارت میں ہاتھ نہ ڈالا۔

لیکن پرتگیزی اس معاملے میں مسلمانوں کے نقش قدم پر چلے۔ ''لنشوٹن نے لکھا ہے کہ وہ کام نہ کرتے بلکہ غلاموں کو جوتے رکھتے جو روزانہ بازار میں بالکل چوپایوں کی طرح بکتے اور ڈیلا ویل کا کہنا ہے کہ گوا کے لوگوں کی ''اکثریت'' غلام ہوتی تھی۔ (66)۔ پرتگیزی ہندوستانی غلاموں کو نہ صرف گھریلو کاموں میں لگاتے بلکہ دیگر کاموں میں بھی لیکن وہ بھی باقاعدگی سے غلاموں کو ابی سینیا اور موزنبق سے خریدا کرتے تاکہ انہیں اچھے داموں گوا اور سورت میں فروخت کیا جائے۔ ان کی بحر ہند پر حکمرانی تھی جہاں بلا خرخشہ سمندری قذاقی کیا کرتے، جس میں غلاموں کو پکڑتے اور انہیں ہگلی، تاملوک، پپلی، سینٹ تھومے، سیلون اور گوا وغیرہ کی منڈیوں میں بیچ ڈالتے۔ پایرارڈ (۱۶۰۸ء۔۱۶۱۱ء) نے یہ اندازہ لگایا کہ دنیا بھر کی تمام اشیائے تجارت پر لازم ہے کہ وہ ارمز سے گزریں اور پرتگیزیوں کو خراج ادا کریں۔ (67)۔ ایسا بھی ہوا کہ ہگلی میں ان کے گورنر مینول ٹراوٗرز نے شاہجہاں کو اس وقت برہم کر دیا جب وہ بطور شہزادہ بغاوت کا مرتکب ہوا تھا اور بے یار و مددگار ہو چکا تھا۔ ٹریورز نے شہزادے کی ایسی کشتیوں پر قبضہ کرلیا جن پر قیمتی مال و اسباب لدا ہوا تھا۔ اور وہ اپنے ساتھ ممتاز محل کی چند کنیزوں کو بھی لے گیا۔ جب شاہجہان بادشاہ بنا تو اس نے بنگال کے صوبہ دار کو حکم دیا کہ وہ پرتگالیوں کے ہوش ٹھکانے لگائے۔ ایک خونریز لڑائی کے بعد جو ہگلی کی بندرگاہ پر ۱۶۳۲ء میں لڑی گئی انہیں بنگال سے بے دخل کر دیا گیا۔ (68)۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہندستان والوں نے دیگر فرنگی مہم جوؤں کو بطور نجات دہندہ کے استقبال کیا جنہوں نے پرتگالی مستبد حکمرانی سے گلو خلاصی دلائی تھی، وہ لوگوں کو جبراً مذہب تبدیل کرنے کو کہتے اور ان کی غلیظ غلاموں کی تجارت۔ (69)۔

ولندیزی بھی غلام تجارت میں ملوث رہے ہیں۔ اس سلسلے میں کوئین کے خیالات جو ایک عظیم گورنر جنرل گزرا ہے قابل ذکر ہیں۔ یہ سال ۱۶۲۳ء تھا اس نے اپنے جانشین کو یہ مشورہ دیا کہ نہ صرف یہ کہ اس ایشیائی تجارت پر قانونی پابندی عائد کردے۔'' بلکہ وہ تمام سرمایہ جو بڑی مدوں میں دستیاب ہے اور ذرائع پیداوار میں لگا ہوا ہے (کئی ہزار غلام)۔۔۔ تاکہ ہماری ملکی تجارت کو برّی راستوں کے ذریعے منافع بخش بنایا جا سکے اور عام محصولات کو بھی۔'' (70)۔ لگ بھگ ۱۶۲۰ء سے ہندستان سے ولندیزی ضروریات میں پہلے تو غلاموں کی متعدد رسدیں تھیں اور اس کے بعد بڑے تسلسل سے کمکوں کی آمد جاری رہی جس کا مقصد خسارے کو پورا کرنا تھا۔ ولندیزی خاندانوں کو جو سپایس جزائر میں مقیم تھے انہیں کافی تعداد میں غلاموں کی ضرورت رہتی ''اکثریت جن کی ہندوستانی نژاد ہوتی۔'' ان کے علاوہ جنہیں مسالے کے کھیتوں میں کام کرنے کا تجربہ ہوتا۔ بہت سے لوگ غلاموں کو درآمد کرتے جن میں ''بنگالدر، ارکانی (برما) اور ملاباری وغیرہ جو جزیروں پر پہنچنے کے بعد موسم کی تبدیلی سے پیدا ہونے

PDF created with pdfFactory trial version www.pdffactory.com

بڑی باقاعدگی سے ہندوستانی بردہ فروشوں سے خریدا کرتے مگر صاحبانِ اختیار کی اجازت سے ۔(71)۔۱۶۶۱ء میں ایک جہاز جو سلطان گولکنڈہ کی ملکیت تھا وہ ۳۰۰ غلاموں کو لئے آچن گیا اور غلام تجارت کو مسلمانوں اور ولندیزیوں میں بھی ''تجارت کی کسی اور شاخ کے عین برابر سمجھا جاتا تھا۔''(72)

اہل پرتگال اور ولندیزیوں کے نقش قدم پر اہل برطانیہ بھی چلتے تھے۔غلاموں اور ''باضابطہ فہرست'' والے ہندوستانی مزدوروں کو برطانوی سلطنت (جب وہ وسعت پذیر تھی) کے تمام گوشوں کو برآمد کیا جاتا مگر یہ ہمارے مطالعے کے مقاصد سے باہر ہے۔مگر فرنگی اقوام کی مساعی، کامیابیوں اور ہندوستانی غلاموں کی برآمد کرنے کے میدان میں جو اکھوا پھوٹا وہ قرون وسطی میں مسلمانوں کے رواج ہی کا تسلسل تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ غلاموں کی تجارت میں جو منافع ملتا تھا اس سے کئی غیر ملکی اقوام کو تحریک ہوتی کہ وہ بھی اس ہوڑ میں شامل ہو جائیں۔تاہم درآمدی غلاموں کے برعکس جن کی قیمتیں رسل و رسائل کے اخراجات کی شمولیت اور سفر کی صعوبتوں میں ہونے والی اموات کے سبب اونچی ہو جاتیں اس کے باوجود ہندو غلام دساور میں کم ہی قیمت پر بکتے۔مثلاً ہندوکش (ہندو کا قاتل) پہاڑ کا نام ایسا اس لئے پڑا کیونکہ غلام بنائے جانے والے ہزاروں ہندوا سے پار کرتے ہوئے مرے۔لیکن ان کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ بچ جانے والوں کی دساور میں قیمتیں پھر بھی کم رہتیں۔

PDF created with pdfFactory trial version www.pdffactory.com

باب۔۱۱

غلاموں کو آزاد کرنے والے قوانین اور غلاموں کی فروخت

سابق صفحات میں دیکھا جا چکا ہے کہ مسلم ملکی حکومت، سماج اور معاشیات میں غلام داری نظام کو نہایت ممتاز مقام حاصل تھا۔ مسلم تاریخ چاہے وہ ملکی ہو یا عالمی اس کے غلاموں کا ذکر کئے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔ غلام حاصل کرنے کے دو اہم ذرائع تھے لوگوں کو پکڑنا یا خریدنا۔ ہم یہاں پر اختصار سے یہ بحث کریں گے کہ اس میں کیا مسائل تھے اور ان قوانین کا ذکر کریں گے جو ان دو گوشوں سے متعلق تھے۔

غلاموں کو آزاد کرنا قبل از اسلام عربوں کی روایت تھی جس سے رائج مذہب میں امتیاز ملتا تھا۔ اس کی رسولؐ اللہ نے بھی تاکید کی۔ ان کی ہدایت دونوں ہی جگہ یعنی قرآن اور حدیث میں ملتی ہے۔ غلاموں کو آزاد کرنے کا دستور کئی اسباب اور دلائل کی بنیاد پر ہندوستان کے طول و عرض میں پایا جاتا تھا۔ مثال کے طور پر اس فرد پر بہت سی برکتیں نازل ہوتی ہیں جو رمضان میں روزہ رکھے۔ اور اگر کوئی عمداً قضا کرے تو اس پر لازم ہے کہ وہ اس گناہ کی تلافی ایک غلام آزاد کر کے کر دے یعنی ہر ناغہ کے لئے ایک غلام کے حساب سے۔ (۱)۔ یا جب شہنشاہ شاہجہاں بیمار پڑا تھا تو اس کی بیٹی نے کئی غلام آزاد کئے، انہیں بستر پر لیٹے ہوئے باپ کے گرد بطور صدقہ گھمایا گیا اور پھر انہیں کہیں دور دراز مقام کی جانب روانہ کر دیا گیا تا کہ تمام بلائیں ان کے ساتھ رخصت ہو جائیں۔ (2)۔ اس کا ذکر نہیں ملتا کہ آیا ان غلاموں کو دور بھیج دیا گیا یا پھر غلام آزاد کرنے کی شرعی قوانین کے مطابق رخصت کر دیا گیا۔ لیکن چونکہ اسلام قانون پر سختی سے عملدرآمد کراتا ہے۔ غالباً انہیں آزاد کرتے وقت مناسب طریقہ اختیار کیا گیا ہوگا۔

قرآن شریف اور احادیث کی تالیف کے بعد فقہہ کے کئی مکاتب فکر پیدا ہو گئے جن کی تشریحات اور تفاسیر کی کئی کتب تیار ہو گئیں جن میں مذکورہ دونوں مصحفی ذرائع سے خوشہ چینی کی گئی تھی۔ ان کے نام ان کے بانیوں پر رکھے گئے، ابوحنیفہ (۶۹۹ء۔۷۶۷ء) ابوعبداللہ محمد بن ادریس (۷۶۷۔۸۲۰) اور احمد بن حنبل (۷۸۰ء۔۸۵۵ء) مالک بن انس (۷۱۵ء۔۷۹۵ء) بالترتیب حنفی، شافعی، حنبلی اور مالکی کہلائے۔ یہ چاروں اسلامی فقہہ کے مدراس فکر آٹھویں نویں صدی عیسوی میں پروان چڑھے۔ جب کہ بارہویں صدی میں شیخ برہان الدین علی (۵۳۰۔۵۹۳ھ مطابق ۱۱۳۵ء۔۱۱۹۶ء) جو ماوراالنہر کے مارغینان عیسوی کے رہنے والے تھے انہوں نے مشہور کتاب ہدایہ تحریر کی یا ہدایت نامہ جو آج بھی سنت الجماعت کی معروف کتاب ہے۔ اس کا انحصار قرآن، احادیث اور چاروں مذکورہ بالا فقہہ جات پر ہے۔ پورے قرون وسطی میں ہندوستان کے مسلم علماء، قانونی مشیر اور قضاۃ انہیں صحایف اور قوانین کی کتب پر تکیہ کرتے جب انہیں غلاموں کے مقدمات سے واسطہ پڑتا۔ اس کے علاوہ مسلم حکمرانی کے زمانے میں جو کئی صدیوں میں پھیلا ہوا تھا۔ لاتعداد عدالتی فیصلے، ضوابط اور تفسیریں قوانین کے امور سے متعلق پیدا ہوتی رہیں۔ جنہیں بطور نظیر پیش کیا جاتا رہا۔ ایسی تشریحات اتنی بڑی تعداد میں بظاہر لامحالہ فکری انتشار کا باعث بن رہی تھیں۔ جن سے بعض اوقات ایسے فیصلے صادر ہو جاتے جو مخصوص فریق کے واسطے سہولت یا کچھ اور حالات پیدا کر دیتے۔ اس لئے شہنشاہ اورنگ زیب نے یہ فیصلہ کیا کہ ہمہ اقسام کے سنّی قوانین کو ایک کتاب میں جمع کر دیا جائے۔ جن کے نتیجے میں ایک ضخیم شاہکار ''فتاویٰ عالمگیری'' نے جنم لیا۔ بختاور خان جو اورنگ زیب کے دربار میں ایک امیر تھا کو فتاویٰ عالمگیری کے متعلق یہ کہنا پڑا۔ ''چونکہ یہ شہنشاہ کا ایک عظیم مقصد ہے کہ تمام مسلمان مذہب کے اصولوں کی پیروی کریں ان اصولوں کی نہایت باصلاحیت افسران قانون اور حنفی فقہہ کے علماء نے تفسیر و تشریح کی ہے۔ قاضیوں اور مفتیوں کے گونا گوں خیالات کے نتیجے میں جنہیں بلا کسی اختیار کے صادر کیا جاتا رہا۔ انہیں واضح اور صاف صاف نہیں سمجھا جا سکتا اور اس وقت تک کوئی ایسی کتاب موجود نہ تھی جو ہمہ گیر ہو۔۔۔ عالم پناہ جو عقائد کے بھی محافظ ہیں نے فیصلہ کیا ہے کہ ہندوستان کے ممتاز صاحبان علم اور لائق لوگوں کا ایک ادارہ قائم کیا جائے۔ جو اس ضخیم کام کو مکمل کرنے کا بیڑا اٹھائے جو نہایت قابل اعتبار کام ہو جس کا ذخیرہ شاہی کتب خانہ میں ایک زمانے سے محفوظ ہے ان سب کا ایک جامع خلاصہ تیار کیا جائے اور اس سے ایک کتاب تالیف کی جائے تمام معیاری قوانین کا مجموعہ ہو۔۔۔ جسے اس طرح مرتب کیا جائے کہ وہ سب کے لئے ایک بہ آسانی دستیاب وسیلہ بنے تا کہ درست اور مسلمہ تفسیروں کی توثیق اور تصدیق ممکن ہو۔ اس دشوار ذمہ داری کا ناظم اعلیٰ اپنے وقت کا سب سے بڑا عالم شیخ نظام تھا۔ اس ادارے کے تمام ارکان کو بڑی بڑی تنخواہیں ادا کی جاتیں۔ اتنی اونچی کہ زمانہ حال (عہد کے ابتدائی برسوں میں) تک کوئی دو لاکھ روپے کی خطیر رقم اس بیش بہا تالیف پر صرف ہو چکی ہے جس میں ایک لاکھ سطروں کا اندراج ہے۔ جب یہ کام بفضل خدا مکمل ہوگا تو یہ پوری دنیا کے لئے قانون کی ایک معیاری تفسیر ہوگی یوں یہ کتاب ہر کہ و مہ کو اسلام کے شارحین کے چنگل سے نجات دلا دے گی۔'' (3)

یوں فتاویٰ عالمگیری ہندوستان میں مسلم قانون کی سب سے اہم کتاب ٹھہری۔ اس کی تالیف آخری مغل حکمرانی میں ہوئی جس میں ان کتابوں سے مدد لی گئی اور قاضیوں کے فیصلوں کو یکجا کیا گیا جو صدیوں سے مسلم حکمرانوں میں ہوئے تھے۔ زیادہ اہم یہ بھی تھا کہ ان کا ماحول ہندوستانی تھا۔ صحایف اور بین الریاستی معاہدوں کے علاوہ قرآن اور ہدایہ کے حوالے بھی تھے۔ اس میں بطور سند قریب قریب تمام عظیم منابع شامل تھے جیسے امام ابوحنیفہ، امام ابویوسف، امام محمد، امام کرخی، قاضی خان کے فتوے، فتح القادری، شرح زیادۃ العتبی اختیار شرع مختیار، محیط سرخی وغیرہ وغیرہ اس طرح ہدایہ اور فتاویٰ عالمگیری قرون وسطی کے ہندوستان میں مسلم غلامی کا مطالعہ کرنے کے واسطے سب سے زیادہ وقیع اور مستند نسخہ جات ہیں۔ ان کے متون مسلمانوں کی زندگی کے تمام گوشوں پر محیط ہیں جن میں وہ دونوں امور بھی شامل ہیں جو زیر بحث۔۔۔ دیکھ بھال اور

PDF created with pdfFactory trial version www.pdffactory.com

غلاموں کو آزاد کرنے کا طریقہ:

غلاموں کو آزاد کرنے کی بابت قوانین کتاب العتق میں درج ہیں اور فروخت کرنے کے کتاب البیع میں۔ لیکن ان میں نہ کوئی ایسی کتاب ہے اور نہ کوئی ایسا باب جو نکاح پر ہو یا طلاق پر، مال کے بدلے مال یا حلف، خرید و فروخت، گروی یا انتقال ملکیت پر، اولاد یا وراثت پر جس میں غلاموں اور کنیزوں کو نمایاں اور بالتفصیل جگہ نہ ملی ہو۔ (5)۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ مسلم سماج بغیر غلاموں کے نامکمل تھا اور غلام داری مسلم حیات کے ہر شعبے میں سرایت کئے ہوئے تھی۔

غلام کو آزاد کرنے کی چار اقسام ہوتی ہیں۔ اول واجب دوم مباح یا حلال (شرع کے مطابق) سوم، مستحب (نیک کام) اور چہارم حرام (ممنوع)۔ غلام کو آزادی زبانی بھی دی جاسکتی ہے اور تحریری بھی لیکن ایسا کرتے وقت چند قوانین مدنظر رہیں جس کے لئے متعین طریقہ اور مخصوص عبارت استعمال کی جائے۔ پکڑا جانے والے غلام اگر کافر ہے تو اسے آزاد نہیں کیا جاسکتا۔ (6)۔ کافر ہونا ایک ''عیب'' تھا جو غلام یا باندی میں ہوسکتا تھا۔ مسلمانوں کو کافر کی قربت سے گھن آتی ہے'' کیونکہ ایک کنیز کے خریدنے کا مقصد ساتھ بسر کرنے کے علاوہ بچوں کی تولید بھی تھا۔'' (7)۔ ٹی۔ پی۔ ہیوز ہدایہ کی سند پر کہتا ہے کہ 'امام، جہاں تک پکڑے جانے والے غلاموں کا تعلق ہے چاہے تو انہیں قتل کروادے کیونکہ رسول اللہؐ اسیروں کو قتل کرادیتے تھے، اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ قتل کرادینے سے بدی ختم ہوجاتی ہے یا پھر وہ اگر چاہے تو انہیں غلام بنالے کیونکہ ان کے غلام بن جانے سے ان کی بدی کا علاج ہوجاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو ایک ثواب بھی حاصل ہوجاتا ہے یا اگر وہ چاہے تو انہیں آزاد کردے اور وہ آزاد ہوتے ہی ذمی بن جاتے ہیں۔۔۔ لیکن یہ شرع کے خلاف ہے کہ کسی عرب بت پرست کو آزاد کیا جائے یا مرتدوں کو۔۔۔ اگر اسیران اسلام قبول کرلیں تو امام کو انہیں موت کے گھاٹ نہ اتارنا چاہئے۔۔۔ لیکن وہ انہیں پھر بھی غلام بنا سکتا ہے یعنی تبدیلی مذہب کے باوجود۔۔۔ (8)۔ لیکن کافر غلام ایسا نہ تھا کہ بے مصرف ہو۔ وہ ایسے کام کرسکتا تھا جو مسلمانوں کے لئے کسرشان ہوں یا ان کی ممانعت ہو۔ (9)۔ ایک مرتبہ جب غلام مذہب تبدیل کرلیتا تو اس کے آزاد ہوجانے کے لئے قانون میں گنجائش تھی۔ اگر کوئی غلام ارتداد کا ارتکاب کرتا تو اس وقت تک آزاد نہ ہوسکتا جب تک دائرہ اسلام میں نہ آجائے۔ ''ایمان کی شرح مرتد کے سامنے بیان کی جائے، جو اگر تین دن کے اندر توبہ نہ کرے تو اسے موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔'' کوئی کنیز یا آزاد عورت اگر ارتداد کا ارتکاب کرے تو اسے ہلاک نہ کیا جائے بلکہ اسے ''روزانہ اتنے دنوں تک بری طرح مارا پیٹا جائے جب تک وہ ایمان نہ لے آئے۔'' (10)۔ کسی مسلمان غلام کو اگر کوئی کافر خرید لے تو وہ کافر کی سرحد میں داخل ہوتے ہی آزاد ہوجائے گا۔ کافر کا غلام مسلمان ہوتے ہی آزادی کے حقوق حاصل کرلیتا ہے۔ (11)۔

غلامی سے آزادی حاصل کرنے کا ایک تسلیم شدہ طریقہ بذریعہ 'تدبیر' تھا۔ یہ ایسا اس لئے کہلاتا جب کوئی آقا اپنے غلام سے کہتا ''تم میری موت پر آزاد ہوجاؤ گے'' اس اعلان کے بعد مذکورہ غلام مدبر کہا جاتا۔ ایسا غلام جو آقا کے اعلان سے مدبر ہوجاتا تو وہ آخر الذکر کی موت کے بعد آزاد شدہ سمجھ جاتا۔ یوں لگتا ہے جیسے آقا یہ ٹھانے ہو کہ جب وہ بوڑھا ہوچکا ہو تو غلام کو آزادی دے دے۔ مگر بردہ بھی اس وقت تک بوڑھا ہوچکا ہوتا اس لئے اس روبہ زوال زمانے میں آزادی ملنے کی فکر سے ہی آزاد ہوچکا ہوتا۔ بڑھتی عمر میں غلام کو پروانہ آزادی دینا غلام کے مقابلے میں آقا کے واسطے کہیں زیادہ مفید ہوتا۔ آخر الذکر تو جب چاہتا اس سے پیچھا چھڑالیتا لیکن آخر الذکر کے لئے کوئی خریدار تلاش کرنا دشوار ہوتا کہ جو اس کی زندگی کے آخری زمانے میں اس کی دیکھ بھال کرے۔ ایسے غلاموں کو جو نوجوانی میں پکڑے گئے ہوتے یا خریدے گئے ہوتے، اتنے نوعمر ہوتے کہ سوتے میں پیشاب کردیتے ہوں۔ جب کہ مسلم قانون کی کتب میں ان کا ذکر بھی ملتا ہے (12)۔ تو وہ سکھ کا سانس لیتے جب انہیں مدبر بنانے کا اعلان کردیا جاتا۔ اگر وہ جوان ہوتے تو آقا کی موت پر لطف اندوز ہوتے۔ لیکن زیادہ تر مدبر اپنے آقا کی خدمت کرتے کرتے بوڑھے ہوجاتے اور زیادہ غالب امکان یہ ہوتا کہ وہ اتنا ضعیف ہوجائے کہ کوئی نیا آقا انہیں خرید کر انہیں کسی سودمند کام میں لگا سکے۔ اس لئے غلام کے لئے مدبری میں کوئی کشش نہ ہوتی۔ اس کے لئے تھوڑی بہت امید اس میں ہوتی کہ آقا، کم عمری میں مرجائے۔ وہ اس کی آرزو بھی کرتا جس کے لئے یا تو وہ محرک بنتا یا پھر سازش میں شریک ہوجاتا تاکہ آقا کو صفحہ ہستی سے ہٹادے جب وہ خود ابھی جوان ہو۔ جس کے لئے وہ اپنے اندر دکھاوے والی وفاداری کی عادت پیدا کرتا اور بہ باطن منافقانہ انداز میں عداوت کی پرورش کرتا رہتا۔ چاہے وفادار ہوں یا نہ ہوں، عمر رسیدہ اور اپاہج غلاموں سے بالعموم نئے بادشاہ یا آقا بذریعہ موت نجات پالیتے۔ جب کہ دوسری طرف قدیم غلاموں کو بھی نئے اعتماد سے عاری نئے نظام میں شریک ہونے میں تذبذب ہوتا۔ جیسا کہ ہم دیکھ آئے ہیں مسلم سماج اور سیاسی ڈھانچے میں ایسے بہت سے واقعات ملتے ہیں۔

اسلامی قوانین میں اس کی گنجائش موجود ہے کہ کسی غلام کو جزواً آزاد کردیا جائے۔ مثال کے طور پر کسی غلام کو کسی مخصوص قسم کے کام کرنے سے ایک مخصوص تاریخ سے روک دیا جائے۔ (13) ایک غلام کو آدھی آزادی عطا کردی جائے یا ایک تہائی یا ایک بٹا چھ بھی۔ یعنی اسے ایک تہائی آزادی مل جائے یوں اسے دو تہائی قیمت پوری آزادی کے حاصل کرنے کے لئے ادا کرنا پڑے گی۔ (14) اگر کوئی غلام دو آقاؤں کی ملکیت ہو تو اس صورت میں آزاد کرنے کا قانون مختلف تھا (15) غلام آزادی ملنے پر عتیق (آزاد شدہ) ہوجاتا یا مولا (طفیلی) اپنے متوفی آقا کا۔ جو اس کا ولی ہوتا۔ (16) غلاموں کو اس کی اجازت نہیں کہ وہ مالک کی منشا کے بغیر شادی کریں۔ (17)۔ آقا چاہے تو اپنے غلام کو ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کی اجازت دے لیکن بیک وقت دو سے زیادہ رکھنے کی نہیں، اس پر زیادہ تر شارحین متفق ہیں۔ (18)۔ غلاموں کے درمیان آقا کی ایما سے ہونے والا بندھن موثر ہوتا مگر بغیر اجازت کی شادی فسخ ہوجاتی (19)۔ کسی کافر جوڑے کی شادی کا بندھن ایمان لے آنے سے فسخ نہ ہوتا۔ اگر ان میں سے کوئی ایک ایمان لاتا تو علیحدگی خود بخود ہوجاتی۔ (20)۔ مرتدین شادی کرنے کے اہل نہ رہتے۔ (21)۔ اگر ماں یا باپ دونوں میں سے کوئی ایک مسلمان ہوجاتا تو بچوں کا مسلمان ہونا ناگزیر تھا۔ (22)۔

ہر غلام لڑکی (کنیز) کو بطور داشتہ استعمال کیا جاسکتا ہے۔ جیسا کہ ہم ہدایہ سے حوالہ دے چکے ہیں ''کسی اناث غلام کو خریدنے کا مقصد ساتھ رہنا ہے اور بچوں کی تولید ہے۔'' اس لئے ہمارے مقصد کے لئے غلام لڑکی (باندی) اور داشتہ جیسے الفاظ کو ہم معنی سمجھا جائے۔ (23)۔ باندی (کنیز) کی خریداری کے وقت باندی کی تندرستی، باقاعدگی سے حیض کا آنا اور کسی بھی جسمانی اور ذہنی کجی کا نہ ہونا اہم ترین ملحوظات ہوا کرتے تھے۔ باندی کے منہ اور بغلوں میں سے کسی بو کا آنا ایک عیب شمار ہوتا کیونکہ اس کی

PDF created with pdfFactory trial version www.pdffactory.com

جو سیاہ فاموں کو 'بدصورت' احمق، بے ایمان، ادنیٰ اور جن کے جسم سے بو آتی ہو' کہتا ہے اور سیاہ فام عورتوں کو ایسے ہی تحقیر آمیز صفات والے ناموں سے۔''سیاہ تر اگر وہ ہیں تو چہرے ویسے ہی بدصورت ہوں گے۔۔۔ان سے کوئی مزا نہیں آتا کیونکہ ان کی بغلوں میں سے بو آتی ہے اور ان کے اجسام بہت کھردرے ہوتے ہیں۔''اسی طرح نابینا ،کانی، بھینگی، گونگی یا بہری باندی یا ایسی عورت جس کی پانچ سے کم یا زیادہ انگلیاں ہوں اسے عیب دار سمجھا جاتا۔اگر پستان بڑے ہوں یا فرج چوڑی یا تھیلے دار (جس سے مطلوبہ لطف نہ آتا) ہوتی چاہے وہ باکرہ یا ثایبہ ہو مشتری کو حق تھا کہ وہ فروخت کرنے والے کو لوٹا دے اور پوری رقم واپس لے لے۔(25)۔اگر وہ چھوٹا موٹا سنگار کرتی ہے اور بولنے یا چلنے میں نفاست ہے تو چشم پوشی کی جاسکتی ہے،لیکن جنس کو اشتعال دلانے کی زیادتی، بولتے میں عمداً دبی زبان، چاپلوسیاں اور چال میں اشتعال انگیز انداز یا پھر کولہوں کا مٹکانا غلام لڑکی کے عیوب میں شمار ہوتے (26)۔مختصراً جنسی دھندہ اور دوغلاپن کسی باندی میں ہونا ناپسندیدہ سمجھا جاتا لیکن یہی عیوب کسی غلام میں اتنے برے نہ سمجھے جاتے جب تک وہ حد سے تجاوز نہ کرتا اور جس سے اس کے فرائض کی انجام دہی میں کوئی خلل نہ پڑتا ہو (27)۔

کسی ام ولد (بچے کی ماں) کی فروخت یعنی اگر کسی کنیز کا اس کے آقا سے حمل ٹھہر جائے اور وہ بچہ جن دے تو یہ ناقابل قبول ہوگا اور اس لئے غلط ہے۔کسی باندی سے آقا کے نطفہ کا بچہ آزاد سمجھا جائے گا۔عورت کو بھی استواد (بچے کی تحویل) کے ذریعے وہی حق مل جائے گا جو بچہ کا ہے۔اس کے بعد کنیز ام ولد کہلائے گی اور آقا کی موت کے بعد آزاد ہو جائے گی۔جیسا کہ رسول اللہؐ نے فرمایا''اس کی پیدائش نے ماں کو آزاد کر دیا۔''(یعنی اس کا بچہ اس کی آزادی کا سبب بنا) ام ولد کو اس لئے فروخت نہیں کیا جاسکتا کیونکہ وہ آقا کی موت کے ساتھ ہی آزاد ہو جاتی ہے۔(28)۔یہ بھی جائز نہیں ہے کہ کسی ام ولد غلام لڑکی (کنیز) کو بطور قرض، رہن یا اجرت کے عوض دیا جائے، لیکن اگر کوئی اجنبی اس سے ہم بستری کرے گا تو آمدنی کا حق دار آقا یا مالک ہوگا۔اگر مالک اسے کسی سے بیاہ دے تو حق مہر کی رقم آقا کو ملے گی۔کسی کنیز کو کسی اجنبی سے بیاہ دینے کا حق آقا کو ہے۔(29)۔باندی آقا کے بس میں ہوتی۔کنیز کے جسم کے کسی بھی حصے کو جزواً یا مجموعی طور پر آزاد کیا جاسکتا ہے۔اگر آقا باندی سے یہ کہتا ہے کہ تیری فرج آج سے آزاد ہے یا تیری پشت یا گردن یا سر آزاد ہوا تو وہ سالم آزاد ہو جاتی کچھ شارحین اس پر متفق تھے مگر دیگر خلاف بھی تھے۔(30)۔آقا اگر چاہے تو اپنی کنیز کو دی ہوئی اجازت کہ وہ اپنے شوہر کے گھر قیام کر سکتی ہے واپس لے لے۔(31)۔اگر مشتری کسی حاملہ باندی کو خریدتا ہے تو جنین سودے کا حصہ ہوگا۔اگر کنیز لوٹ میں ہاتھ آئی ہو تب نوزائیدہ ماں کے ساتھ غلام شمار ہوگا اور آقا کی ملکیت شمار ہوگا۔(32)۔اس کے قوانین بھی موجود ہیں جن سے یہ طے ہو سکے کہ بوقت خریداری یا لوٹ، باندی حاملہ تھی؟(33)۔اگر آقا اپنی کنیز کو مدبر بنانا چاہے تو اس کا زمانہ حمل اور عرصہ پرورش بھی مدبر ہوگا۔اگر محض حمل ہی کو آزاد کیا گیا ہو تب صرف پیدا ہونے والا بچہ آزاد سمجھا جائے گا نہ کہ باندی۔(34)۔اگر کسی باندی کو مدبر یا آزاد کرنے کا اعلان آقا کی جانب سے کر دیا گیا ہو تو بھی وہ اپنی باقی ماندہ زندگی میں باندی کے ساتھ رہ سکتا تھا۔

خرید و فروخت:

اس کا ابتدا ہی میں ذکر ہو جانا چاہئے حالانکہ یہ تکرار سے خالی نہیں ہے کہ غلام آقا کی ملکیت تھا۔غلام ایک اساسی نوعیت کی جائیداد ہوتا ہے جو ہمہ اقسام کی جائیدادوں کی مانند ذریعہ منافع ہے۔(35)۔آقا اگر چاہے تو غلام کو تقریباً ہر قسم کی مراعات اور ایسی ذمہ داریوں سے معمور کر دے جن کا ایک آزاد شخص حقدار ہوتا ہے۔اس کے ساتھ ہی اپنے حق ملکیت پر بھی حرف نہ آنے دے یوں غلام کی حیثیت منسلک تابع کی ہوگی بجائے محض ایک تابع دستاویز کے۔(36)۔اس رواج پر عملدر آمد ہوتے ہم ہر جگہ دیکھ چکے ہیں جیسا کہ ترک غلاموں کے معاملات میں ہوتا تھا کہ ان کے آقا سوداگران سے اچھا سلوک کرتے اور پھر اچھے منافع پر بیچ ڈالتے۔

ہدایہ میں غلام بیچنے کے قوانین اور غلام کے بدلہ غلام حاصل کرنے کے ضابطوں کا ذکر اس ذیل میں کیا گیا ہے جس میں کسی قسم کی جائیداد یا شئے مثلاً آراضی، درخت، کپڑے، پھل، اجناس اور جانور شامل ہیں۔(37)۔کسی غلام کی قیمت کا انحصار اس کی جسمانی طاقت اور اچھی شکل اور دیگر ایسے ملحوظات پر ہوتا جیسے وہ دو یا دو سے زیادہ آقاؤں کی ملکیت ہو یا پھر باندی جو بیک وقت دو مردوں کی ملکیت رہی ہو۔(38)۔اگر کسی کنیز کی ملکیت میں شراکت داری کا معاملہ ہو تو وہ ایسے شخص کی ملکیت بن جاتی جس نے دوسرے حصہ دار کی اجازت سے اس سے مجامعت کی ہو۔(39)۔

اس بابت نہایت صریح احکام تھے تاکہ خرید و فروخت میں کسی تنازع سے بچا جاسکے۔(40)۔مثال کے طور پر اگر غلاموں کے بڑے جتھے میں سے چند ایک کو بیچنا مقصود ہوتا تو ان میں سے جنہیں نکالنا ہوتا تو تعداد کا تعین طاق یا جفت نمبروں سے ہوتا جن کا مالک بیچنے والا آقا ہوتا۔غلام کی صنف کے بیان میں فریب دہی سے سودا ہی منسوخ ہو جاتا یعنی اکل۔(42)

کسی مدبر کو فروخت کرنا، ایک ام ولد کو یا مکاتب کی فروخت کالعدم ہو جاتی۔(43)۔کوئی شخص ایک غلام خریدتا ہے اس پر تشدد کرتا ہے اور مارتا پیٹتا ہے۔اگر اس کے جسم پر تشدد کے نشان نظر آتے ہوں تو خریدار اسے بیچنے والے کو نہ لوٹا سکتا ہے اور نہ ہی زرتلافی کا حق دار ہوگا۔اگر وہ کوڑہ مارتا ہے اور دو تین مرتبہ طمانچے مارتا ہے اور ایسی مار کے نشان مضروب کے بدن پر نہ ملیں تو خریدار کو یہ حق ہے کہ وہ بردہ فروش کو غلام لوٹا دے۔(44)۔ایسا غلام یا باندی جو مفرور ہو انہیں کسی حال میں نہ خریدا جائے بلکہ انہیں آقا کے حوالے کیا جائے۔کسی بھی مفرور غلام کو ہر حالت میں مالک تلاش کر کے اپنے قبضے میں لے۔(45)۔کتاب العتق میں بڑی تفصیل سے جامع قوانین درج ہیں جو مفرور غلاموں کے متعلق ہیں۔(40)۔ان قوانین کے متواتر بیان سے یہ نتیجہ نکلتا ہے جیسے غلاموں کا فرار کوئی حیرانی والی بات نہ تھی۔(47)

ایسے غلام جن کی ہمت شکنی ممکن نہ ہوتی اور مطیع نہ بن پاتے تو وہ کبھی کبھار بدلہ لینے پر اتر آتے۔بیشتر حالات میں تو وہ آقا کو ٹھکانے لگانے کی سازش کرتے۔وہ چوری کرتے اور ستانے کی خاطر ایسی چیزیں بھی کرتے جیسے بستر میں موتنا۔(48)۔جس پر مالک کل آقا ان کی بڑی بے رحمی سے مار پیٹ کرتا۔''ایسا مسلمان جو غلام یا کنیز کا آقا ہوا سے ان کے جسم پر لامحدود اختیارات حاصل تھے۔''مثلاً غلام کو قتل کرنے پر آقا کو قتل نہ کیا جاتا۔(49)۔''یا چوری کرنے پر قانون یہ تسلیم کرتا تھا اور غلام کے اعضا کاٹنے کا رواج عام تھا۔(50)۔اسی وجہ سے جسمانی عیوب اور مثلہ کئے ہوئے غلاموں کو بازاروں میں فروخت کے لئے لے آیا جاتا۔اگر کوئی آقا اپنے غلام کو قتل کر دیتا تو سمجھا

PDF created with pdfFactory trial version www.pdffactory.com

جب عماد الملک بشیر سلطانی جو فیروز تغلق کا غلام امیر تھا۔اور ضعیف ہونے سے ناتواں ہو گیا تو پہلے تو اسے سلطان کے ہاتھ کا لکھا ہوا اپنے لئے پروانہ آزادی ملا اور جس کے بعد اس نے بھی اپنے خرید شدہ چار ہزار غلاموں کو آزاد کر ڈالا۔(52)

قرون وسطیٰ کے ہندوستان میں غلاموں کی فروخت اتنی عام بات تھی کہ جس کا ذکر اس عہد کے فارسی میں لکھے جانے والے وقائع میں تسلسل سے ملتا ہے۔اسی طرح غلاموں کو آزاد کرنے کا بھی سلسلہ چلتا رہتا۔مگر کس تواتر سے اس کا ذکر نہیں ملتا۔اسلام میں یہ خوبی ہے کہ غلاموں کی زندگی کو کس ڈھنگ سے چلایا جائے اس کے لئے تفصیلی قوانین ملتے ہیں۔یہ قوانین کم وبیش سینکڑوں کی تعداد میں ہیں جن میں ان سے کئے جانے والے سلوک اور شرعی فرائض کا ذکر ہے جیسے آزادی دینا اور غلام اور باندی کی خرید وفروخت۔تمام سودے اسلام کے فقہا اور شارحین کے مرتب کئے ہوئے قوانین کے مطابق انجام پاتے۔لیکن ان میں ایک گوشہ عیب کا بھی پیدا ہو گیا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ہی ان کی تعداد میں بے تحاشہ اضافہ ہوتا رہا جس سے امتداد زمانہ کے ساتھ پیچیدگیاں پیدا ہو گئیں۔آٹھویں سے سترہویں صدی تک قوانین کی تعداد ان گنت ہو گئی اور ژولیدگی میں بھی اضافہ ہوا کیونکہ فتاویٰ اور عدالتی فیصلے جو شارحین نے صادر کئے ان پر بھی لازم تھا۔"کہ ان میں بھی سہل اور ثقہ تفسیریں ہوں اور معیاری نصوص ہوں۔" فتاویٰ عالمگیری کے منصوبے کا آغاز کرنے والوں کے پیش نظر مذکورہ خیالات تھے۔یہ قوانین ہر قسم کی صورتحال سے نمٹ سکتے تھے۔چاہے وہ سنجیدہ ہو یا عریانی اور فحاشی پر مبنی۔(53)۔کتاب الطلاق میں مندرج قوانین جنسی تعلیم دینے کے واسطے ایک لاثانی نصابی رسالہ ہے البتہ قوانین کی کثرت تضادات کی حامل ہے جس سے متعدد تشریحات نے راہ پالی۔غلاموں کے مالکان اور قاضیوں نے ان کی خرید وفروخت اور آزاد کرنے میں قوانین کو موم کی ناک بنا کر بہتی گنگا میں خوب ہاتھ دھوئے۔فطری بات تھی کہ غلام بالعموم نادار اور استحصال کے مارے ہوتے اور دست نگر جب کہ ان کے مقابلے میں مالک کل آقا ہوتا۔مگر ہمارے لئے بھی یہ قوانین اور قواعد اپنے اندر ایک اہمیت کے حامل ہیں۔قرون وسطیٰ کے مسلمانوں نے جو تاریخی اور قانونی تصنیفات تالیف کی ہیں ان کی بنیاد پر ہم آج غلاموں کی زندگی ان کی خرید وفروخت، مال کے عوض مال کا سودا، قرض رہن کے معاملات کے علاوہ کئی اور طریقوں سے استعمال کر کے کوئی نتیجہ نکال سکتے ہیں۔

PDF created with pdfFactory trial version www.pdffactory.com

جنسکاری کی غلامی

گذشتہ صفحات میں یہ دکھایا جا چکا ہے کہ کس طرح عورتیں اور بچے پورے قرون وسطیٰ میں استحصال کا خصوصی ہدف بنے۔ دونوں صنفوں کے اسیر بچے بطور مسلمان پرورش پا کر بڑے ہوتے اور سلطانوں، امرا اور اہل ثروت کی مختلف حیثیتوں میں خدمت کرتے رہے۔ نوعمر عورتوں کو کنیز بنانے کی کئی وجوہ تھیں جس میں ان کی جنس سے متمتع ہونا پہلی ضرورت تھی اس لئے ان کی اسیری پر توجہ مرکوز رہتی۔

جنس کے متعلق نفسیات:

اسلام کا آغاز جزیرہ نما عرب میں ہوا جو کم و بیش ریتیلا اور پتھریلا علاقہ ہے۔ وہاں کسی قسم کی پر تعیش جڑی بوٹیاں نہیں پیدا ہوتیں نہ ہی بلند و بالا درخت ہوتے ہیں اور نہ بل کھاتے دریا۔ رسول محمدؐ اکثر کہا کرتے "دیکھنے والے کی آنکھ کو تین چیزیں خوش کرتی ہیں۔" سبز میدان، بہتا پانی اور کھلتے ہوئے چہرے۔ (1)۔ چونکہ قرون وسطیٰ کے عرب سرسبز کھیتوں اور آب رواں سے محروم تھے انہوں نے اور اہل عرب نے حصول مسرت کے واسطے کھلتے ہوئے چہروں پر توجہ مرکوز رکھی۔ یہی مظہر دنیا بھر کی مسلم تاریخ میں نمایاں رہا۔

ایسی مہمیں جنہیں مسلمانوں نے شروع کیا ان میں عورتوں کو پکڑنا آسان ہوتا خصوصاً اس وقت اور آسان ہوتا جب ان کے گھر کے مردوں کا قتل عام ہو چکا ہوتا۔ رسول کا مقصد عظیم یہ تھا کہ مذہب کو فروغ ملے اور جیسا کہ مارگولیتھ نے تبصرہ کیا ہے "ابوبکرؓ (جو محمدؐ کے پیغام کے سب سے بڑے مہم چلانے والے تھے) غالباً یہ سمجھتے تھے کہ عورتیں مردوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ایمان قبول کرنے پر آمادہ ہو سکتی ہیں۔۔۔ غلام بمقابلہ آزاد افراد کے اور مصیبت کا مارا بہ نسبت خوشحال کے اور سب کے آخر میں امیر کبیر۔ (2)۔ غلام عورتیں بالآخر داشتائیں بن جاتیں اور مسلم آبادی میں بے حد و حساب اضافے کی موجب ہوتیں جب بہت بڑی تعداد میں ہاتھ آتیں۔ (3)۔ اس لئے آغاز اسلام ہی سے اس بات پر خصوصی توجہ دی جاتی کہ عورتوں کو غلام بنایا جائے۔

اس کی قرآنی احکام میں بھی ہمت افزائی کی گئی ہے۔ مسلمانوں کو اس کی اجازت ہے کہ بیک وقت وہ چار بیویاں رکھ سکتے ہیں اس کے علاوہ وہ جب چاہیں تو اپنی کسی بھی کنیز سے ہم بستری کر سکتے ہیں۔ سورت ۴ میں تیسری آیت کہتی ہے۔ "نکاح کرو جو تم کو خوش آویں عورتیں" اور ۴:۲۵ کہتی ہے "تو جو ہاتھ کا مال ہیں آپس کی تمہاری لونڈیاں مسلمان۔" اور سورت ۳۳:۵۰ کے بعد اور مسلمانوں کو اجازت ہے کہ وہ شادی شدہ عورتوں کو اپنے تصرف میں لائیں اگر وہ باندیاں اور کنیز ہیں۔ اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے "غیر قانونی ہے تمہارے لئے۔۔۔ شادی شدہ عورتیں سوائے ان کے جسے تمہارے داہنے ہاتھ میں ہوں۔" یعنی کنیزیں جو جنگ میں ہاتھ آئی ہوں۔ اس سلسلے میں سترہویں صدی کے مانکسی کے مشاہدات معنی خیز ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ "تمام مسلمان عورتوں کے شوقین ہیں جو ان کے واسطے سب سے بڑھ کر باعث راحت و چین ہیں اور تقریباً واحد مسرت۔" (4)۔

قرآنی تعلیمات کے مطابق جن کا اوپر ذکر ہوا ہے یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ جب کہ رسول اللہؐ نے مسلمانوں کے لئے قانونی بیویوں کی تعداد محدود کر دی ہے انہیں ان پر لونڈیوں، باندیوں اور کنیزوں پر ایسی کوئی پابندی نہیں عائد کی۔ (5)۔ وہ تمام باندیاں جو جنگوں میں بطور مال غنیمت ہاتھ آئیں وہ مالک کے لئے ایک قانونی ملکیت ہوتیں۔ اور آقا کو یہ اختیار حاصل ہوتا کہ وہ کسی کنیز کو بھی چاہے شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ مصرف میں لے آئے۔ ٹی۔ پی۔ ہیوز اس میں اضافہ کرتا ہے کہ "اس معاملے میں تعداد کی قطعاً کوئی پابندی نہیں ہے کہ کوئی مسلمان کتنی لونڈیوں کے ساتھ رہے۔ اس لامحدود عیش کوشی کی تقدیس نے اسلام کو غیر مہذب اقوام میں مقبول بنانے میں مدد کی جس سے غلامی کو بھی بڑی مقبولیت ملی۔ (6)

اس کے بعد رسول اللہؐ کی زندگی اور خیالات آتے ہیں۔ مسلمان ان کی پیروی کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جہاں تک ممکن ہو سکے پیغمبرؐ کی زندگی کے مطابق۔ ان کی ذات ایک نمونہ تھی جو ہر متقی مسلمان کے واسطے مثالی ضابطہ حیات ہے (7)۔ اس مظہر میں کچھ بھی خلاف معمول نہیں ہے۔ مہاویر کے پیروکار مہاتما بدھ کے، مسیح یا پھر گرو گوند سنگھ کے ہوں ان میں ان کے ہادیوں کی صفات بدرجہ اتم ملتی ہیں۔ ان کی زیادہ تر تعلیمات زبانی تھیں مگر ان کے ملفوظات کو بڑی محبت سے ان کے عقیدت مندوں نے جمع کیا تا کہ ان کی ذاتی زندگی کے لئے رہنمائی ملے۔ ایسا ہی محمدؐ کے ماننے والوں نے کیا احادیث جمع کیں اور ان کی طرز زندگی پر چلنے کی کوشش کی۔ محمدؐ کی زندگی میں عورتوں کی رفاقت کی بہت اہمت تھی۔ ولیم میور لکھتا ہے کہ "عائشہؓ کہا کرتی تھیں رسولؐ کو تین چیزیں پسند تھیں عورتیں، عطریات اور خوراک، اول الذکر دو چیزیں انہیں دل سے مرغوب تھیں مگر آخر والی اتنی نہیں۔ (8)۔ یہی مارگولیتھ نے بھی کہا ہے۔ "کہ وہ تین اشیاء جن کی وہ فکر کرتے تھے وہ عطریات، عورتیں اور عبادت تھیں۔۔۔ (9) یہ تعشقانہ کلمات اور اقوال جو پیغمبر سے منسوب کئے جاتے ہیں کے مطابق عورتوں کا خیال ان کے ذہن میں نمایاں تھا یا پھر نفسیات کی تہوں میں غلبہ تھا۔ (10)۔ یہ بات ڈھکی چھپی

PDF created with pdfFactory trial version www.pdffactory.com

ان کے نقش قدم پر چلنے کی آرزو کے علاوہ محمدؐ کے نظریہ جنت نے مسلمانوں میں عورتوں کی رفاقت پانے کی ایک ہڑک پیدا کردی۔ قرآن کے مطابق جنت میں ’’آرام اور ایسا لطف ہوگا جس میں ہاتھ پیر نہیں ہلانا پڑیں گے۔ ہرے بھرے باغات ہوں گے جنہیں سرسراتے دریا سیراب کر رہے ہوں گے جن میں اہل ایمان، نیم دراز خوشبودار شراب ڈگڈگا کے پی رہے ہوں گے جیسا کہ عرب سامنے دھرے مینا میں یا پھر چاندنی کے پیالے جو دیکھنے میں شیشے کے ہوں اور انہیں نوخیز جوان اٹھائے ہوں۔۔۔ بالیقین! متقیوں کے واسطے یہی خور سندر ہائش ہے، باغات، تاکستان اور دوشیزائیں ابھرے جوبن کے ساتھ اور ہم عمر اور جام لبریز۔۔۔ جنت کی اتنی دوشیزاؤں کو اس طرح متعارف کرایا گیا ہے۔ ’’دلکش آہو چشم دوشیزایں جوان موتیوں سے مشابہ جو صدف میں ہوتے ہیں، یہ صلہ ہے اس عمل کا جو اہل ایمان نے کئے تھے۔۔۔ بالیقین! ہم نے انہیں تخلیق کیا ہے (حوریں) نایاب قسم کی ہم نے انہیں باکرہ رکھا ہے، پرکشش، اور ہم عمر۔ (11)۔

ایسی جنت میں قیام جو ’’شبیہ شہوانیت‘‘ ہو، بقول گبن یہ سب کچھ اہل ایمان کے واسطے اگلی دنیا میں ایک صلہ تھا۔ اس دنیا میں محمدؐ نے مسلمانوں کی ہمت افزائی کی کہ وہ غلام باندیوں کو بلا جھجک اپنے مصرف میں لائیں۔ بالکل آغاز سے ہی ’’محمدؐ نے باندیوں کو قانونی داشتہ کی شکل دے دی تھی ساتھ ساتھ عام بیویوں کے۔ کنیز عورتیں جن کے ساتھ مباشرت کی اس طرح اجازت دی گئی ان کا بھی ان ہی اصطلاحات میں ذکر ہوا جیسا کہ بعد ازاں ان عورتوں کا جنہیں جنگ میں قیدی بنایا جاتا یا بذریعہ خریداری حاصل کیا جاتا مراد یہ ہے۔ ’’وہ جو تمہارے داہنے ہاتھ میں ہوں۔۔۔‘‘ (یہ دراصل) یہ ایک ترغیب تھی کہ اس امید میں لوگ جنگ لڑیں کہ عورتیں ہاتھ آئیں گی جو بعد میں قانونی داشتائیں بنیں گی۔ (12)۔ مارگولیوتھ اسی حقیقی مادے کی مدد سے دعویٰ کرتا ہے کہ ’’یہ تب (تبلیغ اسلام کے ابتدائی برسوں میں) بھی تھا کہ اشیاء اور بیویوں کی حرص (جو کفار میں بھی تھی) کا اعتراف کیا جاتا جس میں پیغمبرؐ کی طرف سے کوئی حوصلہ شکنی نہ کی جاتی۔ (13)

جنسکاری میں خصوصی دلچسپی:

مختصراً عرب کے موسمی حالات جہاں اسلام کی پیدائش ہوئی اور محمدؐ کا طرز بود و باش جو مسلمانوں کے لئے کامل نمونہ تھا اور وہ احکام جو قرآن اور حدیث میں آئے ہیں انہوں نے عورتوں کی بابت مسلمانوں کی نفسیات متعین کی۔ اسلام کثرت ازدواج کی اجازت ناقابل یقین فیاضی سے عطا کرتا ہے۔ کوئی مرد کسی معین وقت پر چار بیویاں رکھ سکتا ہے یعنی اگر وہ پانچویں کا انتخاب کرنا چاہے تو وہ موجودہ چار میں سے ایک کو طلاق دے کر چار کی قانونی حد کے اندر رہ سکتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ جتنی بھی باندیاں یا داشتائیں چاہے رکھ سکتا ہے۔ یہ حدیث میں آیا ہے کہ رسولؐ نے فرمایا کہ ’’جب کوئی اللہ کا بندہ شادی کرتا ہے تو وہ اپنا آدھا ایمان پختہ کرلیتا ہے۔۔۔ جس کے نتیجے میں زاہد اور درویشوں کے سلسلے میں بھی تنہا رہنے پر عائلی زندگی کو ترجیح دی گئی ہے۔ (14)۔ اسلام میں ایک شق عارضی شادی (متعہ) کا بھی حکم ہے، متعدد شادیوں اور طلاق کے علاوہ بیواؤں کی از سرنو شادی اور داشتہ گیری، حاصل کلام جنس کے معاملات میں ہمہ اقسام کے ممانعات اور تکلفات سے انسان کو آزاد کردیا گیا ہے۔ اصرار اس پر ہے کہ ہر فرد شادی کرے اور تجرد پر تیوری چڑھائی جاتی ہے۔ ایک حدیث کے مطابق جس کے راوی ابن عباس ہیں اور جسے ابن سعد نے روایت کیا ہے جس کی شہرت کاتب الوقیدی کے نام سے ہے یہی پیغمبرؐ کے سیرت نگار ہیں، محمدؐ نے فرمایا ’’میری امت وہ بہترین ہے جس کی بیویوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔‘‘ (15)

یہ بات تواتر سے کہی گئی ہے کہ مسلمانوں کو قرآن اور حدیث نے چار بیویاں رکھنے کی اجازت دی ہے۔ مقولات اور اقوال زریں جو اس مظہر پر رائج تھے۔ یہ اشارہ کرتے ہیں کہ بیویوں کا حصول کوئی آسان کام نہ تھا چند ایک کو خریدنا پڑتا اور کچھ کو جنگ میں پکڑا جاتا۔ ایک مثل تو یہ بیان کرتی ہے ’’ایک تو تم سے لڑے گی، دو تمہیں اپنے جھگڑوں میں الجھالیں گی، جب تمہاری تین ہوں گی تو اس کے خلاف جتھ بن جائے گا جسے تم سب سے زیادہ چاہتے ہو، لیکن اگر چار ہوں تو وہ اپنی بیٹھک تیار کرلیں گی جس سے خاوند کو چین کی بانسری بجانے کی فرصت مل جائے گی۔ (16)۔ دوسری ضرب المثل کے مطابق ’’بیویاں تو بھئی چار ہوں۔‘‘ ’’ایک بستر کے واسطے مکھیپ (غلیظ)، گدا باوٹ (فارغ) اور عورتوں کی ملکہ، ترس تو اس پر آتا ہے کہ آخری والی سو میں ایک نکلتی ہے۔ (17)۔ ایک اور کا یہ کہنا ہے ’’مرد کو چار عورتوں سے بیاہ کرنا چاہئے۔ ایک تو ایرانی جس سے بات چیت کی جا سکے۔ ایک خراسانی عورت جو امور خانہ چلائے، تیسری ہندو جو بچوں کی پرورش کرے اور ایک ماورالنہر والی یا تورانی جسے آپ کوڑے لگائیں جس سے باقی تین کے کان ہوں۔ (18)۔ اتنی بہت سے قومیتوں کا کہاوتوں میں تذکرہ سے لگتا ہے کہ بیویوں اور داشتاؤں کے حصول کے لئے تمام ہتھکنڈے استعمال ہوتے ہوں گے جیسے جنگ میں پکڑنا، خریداری، باندی سازی یہ سب طریقہ قرون وسطیٰ کے مسلمانوں میں مقبول ہوں گے۔

بعد کے زمانوں میں کثیر ازدواجی کے رواج کا مسلم فاتحین نے فائدہ اٹھانے میں حدود سے تجاوز کیا۔ کہ محمدؐ نے قانونی بیویوں کی تعداد کو محدود کردیا تھا لیکن داشتاؤں کی تعداد پر کوئی قدغن نہیں لگائی تھی، جو مسلمانوں کی دسترس میں تھیں انہوں نے ’’اس طرح اپنے ماننے والوں کے ذہنوں پر یہ ناگزیر خیال ثبت کردیا کہ ایک غیر معینہ کثیر ازدواجی کا مرتبہ بلند ہے۔۔۔ (19)۔ حضرت عمرؓ خلیفہ دوم نے فوری طلاق کی اجازت دی (یعنی طلاق، طلاق اور طلاق تین مرتبہ بہ آواز بلند کہنے سے) جو طلاق بدعت کہلائی (طلاق کی اختراعی قسم) ’’جس سے کسی بھی غیر معمولی صورتحال سے نمٹا جاسکے جیسے فتوحات والی جنگیں۔‘‘۔ ’’ان جنگوں کے ذریعے عورتوں کے ایسے ریلے آئے کہ طلاق کی تواتر سے ضرورت پڑنے لگی تاکہ نئی بیویاں حاصل کرنے میں سہولت پیدا ہوجائے جس کے لئے پرانی والیوں کو طلاق دینا لازم تھا۔‘‘ دشمن پر فتح کا جشن تو صرف اس وقت تک نہ منایا جاسکتا جب تک دشمن کی بیٹی فاتح کے حرم میں نہ شامل ہوجائے (20)۔ اس تصور پر عملدرآمد میں ہندوستان کے مسلم فاتحین اور حکمران بڑے جوش و خروش سے حصہ لیتے۔

اس لئے اس میں تعجب نہ ہونا چاہئے کہ جس دن سے مسلم حملہ آوروں نے ہندوستان پر دھاوا بولنا شروع کیا اور اس وقت تک جب ان کی سیاسی طاقت میں زوال آنے لگا، عورتوں کو نہایت منظّم انداز میں پکڑا جاتا کنیز اور لونڈی بنالیا جاتا اور یہ سب ملک بھر کے طول و عرض میں جاری رہا۔ دو واقعات جن میں زمانی بعد پایا جاتا ہے ان کا بیان بطور مثال کافی ہوگا۔ جب محمد بن قاسم نے ۷۱۲ء میں دیبل پر چڑھائی کی تمام مرد جن کی عمر سترہ سال سے اوپر تھیں انہیں تہہ تیغ کردیا گیا اور ان کی عورتوں اور بچوں کو

PDF created with pdfFactory trial version www.pdffactory.com

پینے کو پانی دیا گیا اور اس کے بعد ان کے سر قلم کر دیے گئے۔۔۔اور عورتیں اور بچے جوان کے پسماندگان تھے انہیں غلاموں کی طرح ہانک کر لے جایا گیا، تعداد بائیس ہزار تھی، ان میں سے متعدد ایسے بھی تھے جو اپنے علاقے کے ممتاز افراد تھے۔ یہ سیرۃ المتاخرین کا بیان ہے۔"

ان دو واقعات کا انتخاب دو زمانوں میں سے لیا گیا ہے جو ہندوستان میں مسلم حکمرانی کے بعد المشرقین ہیں۔ اور اب یہاں سے یہی طریقہ یعنی دو مثالوں کا جس میں پہلا ابتدائی عہد کا اور دوسرا آخر آخر کا ہو گا۔ ہم اسی اصول پر کاربند رہیں گے۔ اس نمونے کو اختیار کرنے کی وجوہ ہیں۔ فارسی زبان کے وقائع نویس کوئی سائنسی انداز کے مورخین نہ تھے۔ وہ اکثر اپنی نوعیت کے واحد اور اطلاعات کے غیر مربوط واقعات بیان کرتے۔ یہی اوصاف ان حوالہ جات میں بھی ملتے ہیں جو ان امور سے متعلق ہیں جن کا تعلق ہمارے مطالعے سے ہے۔ مثال کے طور پر جب وقائع نویسوں کی اکثریت زمانہ جنگ میں عورتوں کو کنیزیں بنانے کی تفصیلات اور اطلاعات دیتے ہیں ان میں سے چند ہی جیسے ابوالفضل اور شہنشاہ جہانگیر یہ لکھتے ہیں کہ انہیں کیسے پکڑا گیا، امرا اور افسران نے زمانہ امن میں انہیں ورغلایا یا لے بھاگے۔ وہ عورتیں جنہیں جنگ میں پکڑا جاتا ان میں کچھ تو بادشاہ کو مل جاتیں، بہت سی بادشاہ امیروں کو پیش کر دیتا اور بہت سی فروخت کر دی جاتیں۔ لیکن تمام لکھنے والے ان نکات کے بارے میں تسلی بخش معلومات نہیں دیتے اور یہ حال پورے قرون وسطیٰ کا ہے۔ ابن بطوطہ اس "پیش کش" کی تقریب کی تفصیل بیان کرتا ہے جس میں محمد بن تغلق کے عہد میں قیدی غلاموں کو لایا گیا۔ اسی طرح بلغ نی آغ اور منوکسی نے جہانگیر اور شاہجہاں کا حال لکھا ہے۔ بردہ منڈی میں غلام لڑکیوں کی قیمتوں کی تفصیل کا پورا کچا چٹھا چودھویں صدی کے وقائع نویس ضیاء الدین برنی نے لکھا ہے۔ اگرچہ چند ایک نے بھی اس جانب اشارہ کیا ہے مگر سرسری انداز میں کئی لکھنے والے خصوصاً فرنگی سیاحوں نے اس سلوک کا جو کنیزوں سے اور باندیاں جو داشتائیں بن جاتیں تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ لیکن پلسیارٹ اور مانکسی کے واقعات انتہائی مفصل ہیں۔ ہندو حکمرانوں کے خاندان کی بہت سی عورتیں قرون وسطیٰ کے مسلم بادشاہوں سے جبراً بیاہی گئیں اور اس سب کے باوجود صرف شمس سراج عفیفی ان تفصیلات کو بیان کرتا ہے جس میں فیروز شاہ کی ماں کی شادی رجب شاہ سے ہوتی ہے جو بادشاہ کا عم زاد ہے اور شہنشاہ جہانگیر بتاتا ہے کہ اس نے کس طرح ہندو بادشاہوں کی بیٹیوں کا ہاتھ مانگا تھا۔

اس پس منظر میں یہ سارا کام بے سود ہو گا اگر ان تمام واقعات کو یکجا کر کے دفتر کے دفتر سیاہ کیے جائیں جو تکرار سے معمور ہوں۔ پکڑی جانے والی عورتوں کی غلام سازی اور داشتہ گیری کے واقعات کے حقائق اور اعداد و شمار جو مرکزی اور صوبائی بادشاہوں اور خود مختار مسلم ریاستوں سے متعلق ہیں وقایع میں بیان کیے گئے ہیں۔ اس کا محض یہ نتیجہ ہو گا کہ تکرار سے کتاب ضخیم ہو جائے گی۔ اس لئے دو مثالیں ایک زمانہ سلطنت کی اور دوسری مغلیہ دور کی۔ مروجہ نظام کے دو نمونے کافی ہوں گے جو اس پورے دور میں موجود تھا۔ یہ اس لئے بھی کافی ہو گا جس سے گرد و پیش کا وسیع منظر نمایاں ہو جائے گا کہ قرون وسطیٰ میں جنس کاری والی غلامی کے ذریعہ مسلمان کس عیش کوشی میں پڑے تھے۔

غلامی والی جنس کاری ایک ہمہ گیر معاملہ تھا اور چار دانگ پھیلا ہوا تھا جو عصری فارسی وقایع میں بکثرت شہادتوں کی صورت میں موجود ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مسلم مورخین ایسے واقعات بیان کرنے میں بڑے چٹخارے لیتے ہیں اور ایسے حقائق بیان کرتے ہیں جن میں جنسی اور متعلقہ سرگرمیاں اور عیش کوشی بیان کی جاتی ہے۔ دو سلاطین کی زندگیوں میں سے دو واقعات یعنی قطب الدین ایبک اور شمس الدین التمش کو بطور مثال یہاں بیان کیا جاتا ہے۔

قطب الدین ایبک کے کرمان (جو کابل اور بنوں کے درمیان میں ہے) پہنچنے پر تاج الدین یلدوز نے نہایت عزت اور شائستگی سے اس کا استقبال کیا اور اس کے عقد میں اپنی بیٹی دے دی۔ اس موقع کی مناسبت سے ایک ضیافت کا اہتمام کیا گیا اور حسن نظامی کی تاج المعاصر سے شاعرانہ بیان سنیے" ستاروں، حسیناؤں، جام بکف، ساقیوں، گھونگریالی زلفوں، رخساروں، آنکھوں، ہونٹوں، تنگ دہنوں، قامت، نفاست، جاموں، شراب، گویوں، چھتاروں، خوش وضع چڑیوں، ترموں، بانسریوں، ڈھولوں اور صبح اور خورشید کی آغوش میں۔(23)۔ اور پھر جب ایبک نے چند برسوں کے بعد یلدوز کو بادشاہت سے معزول کرنا چاہا تو اس نے غزنی پر چڑھائی کر دی اور تخت پر قبضہ کر لیا۔ لیکن صرف چالیس دن کے لئے کیونکہ وہ اس مدت کے لئے "عیش و نشاط میں ڈوبا رہا" شراب اور رنگ و آہنگ کے طوفان میں اس متواتر رہا وہ ہو میں امور مملکت پس پشت چلے گئے اور یوں "غزنین کے ترک اور معزی ملکوں" نے یلدوز کو دارالحکومت واپس بلا لیا۔ ایبک کی اس وقت حالت ایسی نہ تھی کہ وہ مقاومت کرتا اور دہلی لوٹ گیا۔ (24)۔

اب جو واقعہ بیان ہونے جا رہا ہے وہ سلطان شمس الدین التمش سے متعلق ہے۔ وہ اپنے حرم میں موجود ایک ترک کنیز کے عشق میں بے سدھ ہو رہا تھا جسے اس نے خرید ا بھی تھا اور اس سے مساس کر چکا تھا مگر اپنا مقصد نہ حاصل کر پایا تھا۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ وہ بیٹھا اسی لڑکی کے ہاتھوں سے سر کے بالوں میں خوشبودار تیل لگوا رہا تھا کہ اس نے محسوس کیا کہ جیسے اس کے سر پر آنسو گر رہے ہوں۔ جس پر اس نے اوپر کی جانب دیکھا تو اس نے لڑکی کو روتے پایا۔ اس نے رونے کا سبب پوچھا۔ جس پر لڑکی نے جواب دیا، کبھی میرا بھی ایک بھائی تھا اور اس کی چندیا پر ایسا ہی گنج تھا جیسا تمہارے سر پر ہے جس نے اس کی یاد دلا دی۔ اس پر مزید تحقیقات شروع ہوئیں اور یہ کھلا کہ مذکورہ کنیز اس کی اپنی بہن تھی۔ ان دونوں کو بچپن میں بطور غلام بیچ ڈالا گیا تھا فروخت کرنیوالے ان کے سوتیلے بھائی تھے اور یوں مالک کل رب نے اسے ایک گناہ کے ارتکاب کرنے سے بچا لیا۔ بدایونی نے اپنی کتاب میں لکھا ہے" کہ یہ ماجرا میں نے اپنے کانوں سے سنا ہے، وہ بھی شہنشاہ اکبر کے ہونٹوں سے اور تاجور کا کہنا تھا کہ اس واقعے کی روایت سینہ بہ سینہ سلطان غیاث الدین بلبن سے چلی آ رہی ہے۔"(25)

جبراً شادیاں:

بزور ہونے والی شادیوں کو ملائم پیرائے میں ازدواجی اتحاد کہا جاتا ہے جس کا قرون وسطیٰ میں ہونا عام بات تھی۔ ان میں سے چند ہی ایک کو مسلم وقایع میں جگہ ملی اور تلخ تفصیلات کے ساتھ یہاں پر ہم ایک مثال پیش کرتے ہیں جس کا راوی شمس سراج عفیف (چودھویں صدی کا) چونکہ یہ فارسی میں ہے اس لئے اس کے ترجمہ کا خلاصہ کچھ یوں ہے۔ فیروز شاہ تغلق کا سال پیدائش ۷۰۹ھ تھا (۱۳۰۹ء) اس کے باپ کا نام سپہ سالار رجب تھا جو سلطان غیاث الدین تغلق، غازی ملک کا بھائی تھا۔ تینوں بھائی یعنی

PDF created with pdfFactory trial version www.pdffactory.com

سونپ دی۔تغلق کی یہ آرزو تھی کہ اس کے بھائی سپہ سالار رجب کی شادی دیپالپور کے کسی رئیس کی بیٹی سے ہوجائے۔اسے کہیں سے اطلاع مل چکی تھی کہ رانا مل بھٹی کی بیٹیاں نہایت حسین اور لائق ہیں۔تغلق نے رانا مل کو شادی کا پیغام بھیجا۔رانا مل نے انکار کر دیا۔جس پر تغلق ان دیہات (تلونڈی) کی جانب روانہ ہوگیا جو رانا مل کے تھے اور اس سے مطالبہ کیا کہ وہ پورے سال کی مالگذاری یکشمت ادا کرے۔مقامی حکام مقدمین اور چودھریوں پر جبر کیا گیا۔رانا مل کے لوگ بے بس تھے اور کچھ نہ کر سکے کیونکہ وہ **علاءالدین خلجی کا زمانہ تھا اور کوئی بھی آہ وزاری کرنے کی جرأت نہیں کرسکتا تھا**۔ایک دوشیزہ کو دیپالپور لایا گیا۔شادی سے پہلے وہ بی بی نائلہ کہلاتی تھی۔سپہ سالار رجب کے محل میں آنے کے بعد اسے آرائشی نام سلطان بی بی کدبانو مل گیا۔چند برس گزرنے کے بعد اس نے فیروز شاہ کو جنم دیا۔(26)۔اگر یہ سب ایک علاقائی افسر کا ہتھکنڈا تھا تو بادشاہ کا ہاتھ کون پکڑ سکتا تھا۔سترہویں صدی میں جہانگیر اپنی سوانح میں لکھتا ہے کہ اپنے جلوس کے تین سال بعد ''میں نے جگت سنگھ کی بیٹی کا رشتہ مانگا جو راجہ مان سنگھ (امرا) کا بیٹا تھا۔(27)۔راجہ رام چندرا بندیلا کو شکست ہوئی،قید ہوا جسے بعد ازاں جہانگیر نے رہا کر دیا۔(28)۔اس کے بعد جہانگیر کہتا ہے''میں نے رام چندرا بندیلا کی بیٹی کو اپنی ملازمت میں لے لیا (مراد ہے بیاہ کرلیا)۔(29)

ایسی ''شاہی شادیوں'' کی جنسکاری کی غلامی کے باب میں شمولیت کی وجہ عیاں ہے۔مندرجہ بالا ''شاہی اعلانوں'' کی زبان ظاہر کرتی ہے کہ ایسی بیویاں یا پھر ذیلی بیویوں کا جب بھی ذکر آتا تو ہمیشہ یہ کہا جاتا کہ انہیں ملازمت میں لیا گیا ہے یا پھر انہیں زنانہ ملازموں کے زمرے میں ڈال دیا جاتا یا پھر ناموری کی خاطر انہیں بادشاہ کے حرم میں داخل کر دیا جاتا۔اس انداز کی زبان اس وقت نہیں استعمال کی گئی جب نور جہاں یا ممتاز محل کی شادیاں ہورہی تھیں۔ان بیویوں کی حیثیت داشتاؤں سے زیادہ نہ تھی۔مسلم شاہیت اور امرا میں داشتائیں رکھنے کا عام رواج تھا۔مسلم حکمرانوں میں جو بچے داشتاؤں سے پیدا ہوتے انہیں منکوحہ سے پیدا ہونے والے بچوں کے برابر سمجھا جاتا، اگر چہ یہ قرآن میں بالصراحت نہیں لکھا۔ہونہ ہو پہلی صدی ہجری ہی میں روایت نے اپنی جگہ بنالی ہوگی۔(30)۔ایسے اتحاد سے ہونے والے بچے آقا کے ہوتے اور اس لئے آزاد شہری ہوتے لیکن داشتہ کا مقام محض اتنا ہی بڑھتا کہ اسے ''بچوں کی ماں'' کا درجہ مل جاتا۔(31)۔بطور مثال سلطان سکندر لودھی (۱۴۸۹ء-۱۵۱۷ء) کا معاملہ دکھایا جاسکتا ہے۔اس کی ماں زیبا ابتدا میں ہندو تھی اور اس کا نام ہیما یا پھرانبا تھا۔بہلول لودھی اس کی خوبصورتی پر ریجھ گیا جن دنوں وہ سرہند کا صوبیدار تھا۔اس نے دہلی کے تخت پر بیٹھنے کے بعد اس سے شادی کی۔اس کے نو بیٹے پیدا ہوئے۔زیبا سے ہونے والا لڑکا اس کی اولاد میں سب سے نہ تو بڑا تھا اور نہ ہی اس کی ماں پہلی پیدائشی ہندو عورت تھی۔(32)۔اگرچہ داشتاؤں سے پیدا ہونے والے بیٹوں کا بڑی بے تکلفی سے ذکر کیا جاتا تھا جس میں کوئی چیز مانع نہ ہوتی۔(33)۔ہندو داشتاؤں نے مسلم نفسیات پر تھوڑا سا ہی اثر چھوڑا۔جو اس بات سے ظاہر ہوتا ہے، حالانکہ فیروز تغلق اور سکندر لودھی کی مائیں پیدائشی ہندو تھیں۔مگر ان کے مسلم بیٹے کٹر مذہبی بنے۔

ماضی میں چند ایسی شادیاں بھی ہوئیں جن میں جبر شامل نہ تھا۔لیکن شادی کرنے والی عورت کو اس کے اپنے عزیزوں نے واجب عزت نہ دی۔مسلم حکمراں طبقوں کے گھروں میں ایسی عورتوں سے کنیزوں اور داشتاؤں سے بہتر سلوک روا نہ رکھا جاتا۔رانی لاڈی اور دیول رانی کے معاملات مناسب مثالیں ہیں۔محمد بن قاسم نے رانی لاڈی کو پکڑا تھا جو راجہ داہر کی شریک حیات تھی۔یہ زمانہ سندھ پر چڑھائی کا تھا۔بعد میں محمد بن قاسم نے اس سے شادی کرلی یہ سوچ کر کہ وہ اپنے لوگوں پر خوشگوار اثر ڈال سکتی ہے۔اس نے قلعہ کے لوگوں کو طاقتور حملہ آوروں سے تعاون کرنے پر آمادہ کرنے کے لئے بھیجا۔لیکن ''وہ لوگ جو قلعہ کی فصیل پر کھڑے ہوئے تھے انہوں نے یہ کہتے ہوئے تھوتھو کی کہ تم چنڈالوں سے مل گئی ہو اور ملیچھ ہو چکی ہو،تم ہماری حکمرانی پر ان کی حکومت کو ترجیح دیتی ہو،اس کے بعد وہ اس سے بدکلامی پر اتر آئے۔''(34)۔دیول دیوی گجرات کے راجہ کرن باگھیلا اور ملکہ کملا دیوی کی بیٹی تھی۔کملا دیوی (۱۲۹۹) میں گجرات کی فتح کے دوران میں ہاتھ آئی تھی جس سے علاءالدین خلجی نے شادی کرلی۔شرع کے مطابق کافر عورت مسلمانوں سے شادی کرسکتی ہے چاہے اس کا شوہر حیات ہو۔(35)۔کیونکہ قید ہوتے ہی شادی فسخ ہوجاتی ہے۔(36)۔بعد میں اسی کی بیٹی دیول دیوی بھی ایک مہم میں پکڑی گئی اور دہلی لائی گئی۔(37)۔جہاں اس کی شادی علاءالدین کے بیٹے خضر خاں سے اس لئے کردی گئی کیوں کہ وہ اس پر فریفتہ ہوگیا تھا۔(38)۔تخت نشینی کی سیاسی جنگ میں خضر خان کے قتل ہوجانے کے بعد اس سے اس کی منشاء کے خلاف قطب الدین مبارک خلجی نے بیاہ رچالیا۔(39)۔قطب الدین (مبارک خلجی) کا قتل خسرو خان کے ہاتھوں ہونے کے بعد وہ آخرالذکر کے حرم میں شامل کرلی گئی۔قصہ مختصر شہزادی سے روا رکھا جانے والا خلجی خاندان کا سلوک کسی صورت میں بھی بطور اسباب یا منقولہ جائیداد سے زیادہ نہ تھا۔(40)۔حالانکہ ایسی ''بیویاں'' کم وبیش کنیزوں یا داشتاؤں والے سلوک کی مستحق ہوتیں۔وہ بسا اوقات اپنے ہمراہ متعدد باندیاں بھی لاتیں جو ان کی حرم میں خدمت کرتیں۔دور سلطنت میں اس کی بہترین مثال ملک محمد جایسی کی ''پدماوت'' میں مل سکتی ہے۔پدماوت کی کہانی ممکن ہے تمثیلی ہو۔لیکن اہم حقیقت یہ ہے کہ پدمنی اور اس کی ۱۶۰۰ سکھیوں اور باندیوں کو پالکیوں اور پینسوں (فی الواقع جنگجو راجپوت جنہوں نے رتن سنگھ کی جان بچائی) میں ڈھو کر علاءالدین خلجی کے محل تک پہنچایا تھا۔(41)۔جیسا کہ پہلے بھی کہا جاچکا ہے کہ اکبر کے حرم میں ۵۰۰۰ عورتیں تھیں جن کے پاس خدمت کے واسطے اپنی باندیاں بھی تھیں۔فاتح اور حکمران مغلوں کے لئے ایسی عورتوں کی کوئی کمی نہ تھی۔

کنیزوں کی تقسیم:

ایسی شادیاں اپنے ساتھ ملازمین اور باندیاں لاتیں لیکن کنیزوں کی بڑی تعداد قرون وسطی میں دھاووں مہموں اور جنگوں میں ہاتھ آتی۔ہم اس سلسلے میں مسلمانوں کی کامیابیاں محمد بن قاسم کے زمانے سے لے کر آنے والے دور میں مختصراً دیکھ چکے ہیں۔یہ ایک دائمی پالیسی تھی کہ تمام مردوں کو قتل کردیا جائے خصوصاً جو اسلحہ اٹھانے کے قابل ہوں اور ان کی بے یارو مددگار عورتوں کو کنیز بنالیا جائے۔(42)البلادری رقمطراز ہے کہ ''ایسے صوبے دار (جو قاسم کے بعد مقرر ہوئے) وہ دشمنوں کو قتل کرتے رہے اور جو کچھ ہاتھ لگتا سمیٹ لیتے۔۔۔(43)۔اسیران میں سے زیادہ تر کو امرا اور سپاہیوں میں تقسیم کردیا جاتا،اس دستور کی دو مثالیں دی جاتی ہیں ایک زمانہ سلطنت سے اور دوسری مغلیہ عہد کی ہے۔

PDF created with pdfFactory trial version www.pdffactory.com

حکومت میں ہندوستان کا دورہ کیا اور ایک طویل عرصہ تک دربار سے وابستہ رہا لکھتا ہے ’’ایک دن کا واقعہ ہے کہ دہلی میں کافر اناث اسیر آئیں جن میں سے دس کو وزیر نے مجھے بھیج دیا۔ ان میں سے ایک کو میں نے لانے والے کے حوالہ کردیا۔۔۔ میرے رفیق نے تین لڑکیاں لے لیں۔ میں نہیں جانتا کہ باقی کا کیا ہوا۔ (44)۔ مسلم تہواروں پر بڑے پیمانے پر کنیزوں کی تقسیم جیسے عید کے متعلق لکھتا ہے کہ ’’پہلی بات تو یہ ہے کہ کفار راجاؤں کی لڑکیاں جو سال بھر میں پکڑی جاتی تھیں وہ آ کر ناچتی گاتی تھیں۔ اس کے بعد انہیں امرا اور اہم غیر ملکیوں کو مرحمت کردیا جاتا۔ اس کے بعد دیگر کافروں کی بیٹیاں ناچا اور گایا کرتیں۔۔۔ سلطان انہیں اپنے بھائیوں، عزیزوں، بیٹوں اور ملکوں وغیرہ کو دے دیتا۔ دوسرے دن عصر کے بعد اسی قسم کا دربار لگتا۔ گانے والی عورتیں لائی جاتیں۔۔۔ سلطان پھر انہیں مملوک اور امیروں میں بانٹ دیتا۔۔‘‘ (45)۔ ہزاروں غیر مسلم عورتیں بعد کے برسوں میں اسی طرح تقسیم کی جاتی رہیں۔ (46)۔

شاہجہاں نے ۱۶۳۲ء میں ہگلی کے مقام پر پرتگالیوں پر حملہ کیا اور بہت سی عورتیں پکڑ لیں، ان میں سے ایک ماریا۔ ڈی۔ ٹیڈز تھی ’’بہنوں میں سے ایک بادشاہ شاہجہاں کے محل میں مقیم ہے۔‘‘ (47)۔ ماریا۔ ڈی۔ ٹیڈز کو بعد ازاں علی مردان خان سے بیاہ دیا گیا۔ (48)۔ کوئی تھوماز یا مارٹنس بھی ایسی تھی جسے ہگلی کی فتح میں پکڑا گیا تھا۔ اس جیسی متعدد عورتوں کو امرا میں تقسیم کیا گیا تھا۔

حملوں کے دوران میں جوہر:

ایسی نازک صورت میں ہندوستانی عورتوں کا ردعمل کیا ہوتا، جب پورا سندھ محمد بن قاسم کی افواج کے سامنے چت لیٹ چکا تھا ’’راجہ داہر کی بہن بائی نے قلعہ راوڑ کی تمام عورتوں کو جمع کیا اور ان سے یوں خطاب کیا: یہ اب طے ہے کہ ہم ان چنڈالوں اور گاؤ خوروں کے چنگل سے بچ کر نہیں نکل سکتے۔۔۔ چونکہ اب نہ تو حفاظت کی کوئی امید ہے اور نہ ہی آزاد رہنے کی، ہمیں چاہئے کہ ہم آگ جلانے والی لکڑی، سوت اور تیل جمع کر کے خود کو جلا کر راکھ بنا ڈالیں اور اس طرح ہم اپنے شوہروں سے (اگلی دنیا میں) مل جائیں گے۔ اگر کسی کا جی چاہتا ہے کہ وہ دشمن سے جا کر رحم کی درخواست کرے وہ جا سکتی ہے۔۔۔ لیکن وہ سب کی سب ہم خیال تھیں اس لئے وہ کسی گھر میں داخل ہوئیں اور اسے آگ لگا ڈالی اور جلد ہی راکھ کا ڈھیر بن چکی تھیں۔ (49)۔ اس کے بعد پورے قرون وسطیٰ میں جیسے ہی یقین ہوجاتا کہ شکست ہونے والی ہے اور تمام مرد قتل ہوچکے ہیں تو عورتیں جوہر (جان دینا) کی آگ میں بھسم ہوجاتیں چند واقعات ایسے بھی ہوئے ہیں جن میں مسلم خواتین نے بھی یہی کیا۔ (50)۔ کیونکہ یہ ہندو روایت کا اثر تھا۔ چتوڑ پر اکبر کی چڑھائی کے دوران میں بھی ایک واقعہ کا ذکر ہونا چاہئے جس کا تعلق مغل دور سے ہے۔ وہ رات ۲۳ ویں فروری ۱۵۶۸ء کی تھی راجپوت سپہ سالار جے مل کی موت سے چتوڑ کے لوگوں کی ہمت کچھ ایسی پست ہوئی کہ انہوں نے ٹھان لیا کہ جوہر کی ریت پر عمل کیا جائے۔ قلعہ کے مختلف مقامات پر آگ بھڑکنے لگی اور عورتوں کو شعلے نگلنے لگے پتا کے گھر میں جوہر منعقد ہوئی جو سی سودیا قبیلہ کی ملکیت تھا۔ یہ راٹھور خاندان کا تھا جس کا سردار صاحب خان تھا اس کے علاوہ چوہان بھی تھے جن کا سردار ایسر داس تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ۳۰۰ سے زیادہ عورتیں اس تباہ کن آگ میں جل مریں۔ (51)۔

لیکن سب ہی نہ اتنی بہادر تھیں اور نہ اتنی خوش نصیب کہ اس پکڑ دھکڑ سے بچ جائیں شاہجہاں کے زمانے میں اورچا کے مقام پر جوجھر سنگھ بندیلا نے مزاحمت کی تھی، وہاں بہت سی عورتیں پکڑی گئیں اور ان سے بڑا بے رحمی کا سلوک کیا گیا۔ جھجر سنگھ اپنے قلعہ چوراگڑھ کو خالی کر کے نہایت تیزی سے دکن کی جانب روانہ ہوگیا۔ اس نے اپنی کئی عورتوں کو اس لئے ہلاک کردیا کیونکہ وہ اپنے گھوڑوں سے گر پڑی تھیں۔ باقی ماندہ نے گولکنڈہ کی راہ لی لیکن ان پر ناگہانی آفت آ پڑی۔ ان کے پاس اتنا وقت نہ تھا کہ وہ جوہر کی تمام رسوم ادا کرلیتیں اس لئے کئی عورتوں کی پیٹھ میں چھرا گھونپ دیا گیا۔ مغلوں نے ان مجروح عورتوں کو اٹھالیا اور انہیں لے بھاگے۔ (52)۔ یہی وہ تمام ہتھکنڈے تھے جن سے عورتوں کو پکڑا جاتا پھر حرم میں خدمت کرنے کے واسطے مسلم زعماء میں تقسیم کردیا جاتا۔

کنیزوں کے اطوار:

کنیزوں کو تین درجوں میں چاہیں تو تقسیم کیا جاسکتا ہے جس کی اساس ان کا چال چلن اور رویہ ہے ایک طبقہ تو ہوتا بامراد عیار اور کائیاں کا جو حرم میں اثر و رسوخ حاصل کرنے کے لئے کوشاں رہتا۔ اس کے برعکس سادہ لوح، بے ضرر اور فرماں بردار قسم کی ہوتیں۔ ان کے درمیان ایسی ہوتیں جو عروج کی جویا ہوتیں جس کے واسطے وہ حسن اور عشوہ و ادا استعمال کرتیں مگر وہ وفادار اور چاہنے کے قابل ہوتیں۔

ہندوستان میں مسلم حکمرانی کے آغاز میں شاہ ترکان کی بالادست اور دلفریب شخصیت ہماری توجہ مبذول کرتی ہے۔ منہاج سراج کے بیان کے مطابق جو عصری وقائع نگار طبقات ناصری کا مصنف تھا کہتا ہے ’’کہ شاہ ترکان ایک ترک ماما تھی اور التمش کے پورے حرم کی سربراہ تھی۔‘‘ (53)۔ اس نے داؤں پیچ کر کے اپنے نام کے واسطے لاحقہ خداوند جہاں حاصل کرلیا اور ایسے مرتبہ کو پہنچی ’’(جو عورتوں میں) عظیم ترین اور حرم میں برگزیدہ ٹھہری اور اس کی رہائش گاہ شاہی محل بنا۔ (54)۔ اس کی عادت تھی کہ وہ دربار کے امرا کو بیش بہا تحائف دیتی تاکہ اپنے بیٹے کی تخت نشینی کے لئے حمایت حاصل کرسکے۔ اس کی تحریک پر شاہی احکام اور فرامین جاری کئے جاتے جن پر اس کا نام درج کیا جاتا اور التمش کی موت کے بعد اس نے بادشاہ کی کئی محبوب عورتوں پر تشدد بھی کرایا۔ (55)۔ مغل دور اقتدار میں ہمارے پاس لال کنور کی تسلیم شدہ مثال ہے اور جس کی جگہ لینے کو تیار زہرہ بھی تھی۔ دونوں ہی مغل شہنشاہ جہاں دار شاہ (۱۷۱۲ء) کی داشتہ تھیں۔ لال کنور ایک گنوار اپنے خیالوں میں گم قریوں اور گلیوں میں ناچنے والی لڑکی تھی۔ (56)۔ اسے ایک خطیر مشاہرہ ملتا اور وہ نور جہاں کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرتی جو جہانگیر کی ملکہ گزری ہے۔ (57)۔ لال کنور کے تمام بھائیوں اور رشتہ داروں۔۔۔ کو چار ہزاری اور پنج ہزاری کے مناصب دیئے گئے۔۔۔ اور ان کے قبیلہ میں مراتب بھی بلند کئے گئے۔ (58)۔ بات فطری ہے کہ ذی علم اور باصلاحیت افراد دربار سے

PDF created with pdfFactory trial version www.pdffactory.com

زہرہ اپنے ہاتھی پر اپنے حالی موالیوں کے ساتھ جا رہی تھی جو منہ زوروں کا دھڑا تھا۔ چن قلیچ کا بھی اسی راستے سے گزر ہونے لگا اور اس کے قافلے سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ جنرل کے لوگ ایک جانب سمٹ گئے لیکن زہرہ نے چلا کر کہا ''اے قلیچ خاں لگتا ہے جیسے تو کسی اندھے باپ کی اولاد ہے کہ رستہ نہیں چھوڑتا۔'' ان لفظوں نے سپہ سالار کے تن بدن میں آگ لگا دی، جس پر اس نے اپنے لوگوں کو اشارہ کیا کہ گنوار عورت کے ملازموں کے ہوش ٹھکانے لگا دو۔ اس کے ملازموں اور ہیجڑوں کی مرمت کرنے کے بعد ''انہوں نے زہرہ کو کھینچ کر ہاتھی سے اتار کر دے مارا اور اسے کئی گھونسے اور ٹھوکریں لگائیں۔'' (59)۔ شاہ ترکان، لال کنور اور زہرہ کی طرح کی عیار اور متکبر عورتیں مسلم حرموں میں عموماً ہوتیں۔ نہ ہی کوئی ایسی بات تھی کہ سب ہی عورتیں اسی قسم کی گنوار اور اجڈ ہوتیں اگر چہ وہ بھی چلتا پرزہ ہوتی تھیں۔ اورنگ زیب نے اپنے بھائی شہزادہ مراد کو اپنی متعدد داشتاؤں میں سے کسی ایک کی مدد سے قید کر کے بندی خانے میں ڈالا تھا۔ (60)۔ اودے پوری محل جو ایک جارجیا (کوہ قاف کے علاقے) کی کنیز تھی اور شہزادہ داراشکوہ کی داشتہ تھی اپنی مرضی سے اس وقت اورنگ زیب سے جا ملی جب اسے اقتدار ملا تھا۔ (61)۔

جب کہ دوسری جانب ایسی عورتیں بھی تھیں جن میں جاں نثاری کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ اکبر کو بتایا گیا کہ چونکہ مسیحیوں میں یک زوجگی کا حکم ہے اس لئے ان کی عورتوں کو وابستگی اور اطاعت ضرب المثل ہے۔ ''ان میں غیر معمولی بات یہ ہے'' تو اکبر نے تڑاق سے مسیحی فادر کو جواب دیا۔ ''تو یہ بات تو ہمارے برہمنوں کے دھرم (ہندومت) میں بھی ہے۔ ہمارے ہاں لاتعداد ایسی داشتائیں پڑی ہیں اور ان میں سے متعدد کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے نہ سراہا جاتا ہے۔ اور وہ اپنے دن پارسائی کے نہاں خانوں میں گزار ڈالتی ہیں۔ بایں ہمہ اور زندگی کی مذکورہ تلخیوں کے باوجود وہ محبت اور ہمدمی کی شعلہ بار مشعلیں ہیں۔'' ایسی نیک اور پارسا ارواح کے متعلق سنتے ہی اس متبرک اجتماع میں موجود جویائے دانش حیرانی کے تالاب میں غوطہ کھانے لگے۔ (62)۔ ایسی عورتوں کی جاں نثاری کی بڑی شہرت تھی۔ جہانگیر لال کلونت کی کہانی سناتا ہے ''ایک مغنیہ جو میاں لال بھی کہلاتی (63)۔'' جو اپنے بچپنے سے میرے والد کی خدمت کر کے پروان چڑھی۔۔۔ جن کا انتقال ۶۵ یا ۷۰ ویں برس کی عمر میں ہوا۔ ان کی لڑکیوں (داشتاؤں) میں سے ایک نے اس صدمہ پر غمزدہ ہو کر افیم کھا کر جان دے دی۔ مسلمانوں میں چند ہی عورتوں نے ایسی ہمدمی دکھائی ہو۔'' (64)۔ روپ متی جو سارنگ پور کی رہنے والی تھی اپنے عاشق باز بہادر کی وجہ سے نہایت دلیری سے ہلاکت خیز زہر کا پیالہ غٹا غٹ پی گئی اور اپنی عصمت اپنے ساتھ عدم کی تاریک راہوں میں لے گئی بجائے آدم خان کے چنگل میں آنے کے۔ (65)۔ اس سے پہلے دیول رانی تھی جو اگر چہ اتنی خوش نصیب نہ نکلی لیکن اتنے ہی پر عزم کردار کی مالک تھی۔ ہندو داشتاؤں کی وفاداری ضرب المثل ہے لیکن ایسا نہیں ہے کہ مسلمان عورتیں اس سے عاری ہوں۔ اکبر آبادی محل اور فتح پوری محل نے آگرہ کے قلعہ میں شاہجہاں کا جنوری ۱۶۶۶ء تک پورے زمانہ اسیری میں اور بستر مرگ پر آخری سانس تک ساتھ دیا۔ رعنائے دل ابتدا میں کنچنی یا ناچنے والی لڑکی تھی پھر وہ شہزادہ داراشکوہ کی محبوب داشتہ ہوگئی۔ اس کا سر قلم ہونے کے بعد اورنگ زیب نے اس کا ہاتھ تھامنا چاہا مگر اس نے انکار کر دیا۔ (66)

انتہائی واقعات جن میں جھگڑالو اور مرد مار عورتیں ایک طرف اور ایسی جو جاں نثار اور فدا ہونے والی دوسری جانب ہوں انگلیوں پر گنی جا سکتی ہیں۔ مسلم حرموں میں زیادہ تر دلکش اور معقول اطوار والی عورتیں راہ پاتیں۔ قرون وسطی میں قطع اعضا اور خصی کر دینے والی سزائیں عام بات تھی جو زمانہ جنگ اور امن میں مردوں کو دی جاتیں اور ان کی خوبصورت عورتوں کو زعماء کے حرم کی زینت بنا لیا جاتا۔ اس کے علاوہ ''نقرئی بدن والی دوشیزائیں جن کی مشکی زلفیں ہوتیں'' ایسی عورتوں کو ہندوستان اور دساور کی بردہ منڈیوں سے خریدا جاتا۔ یوں حرم مختلف ممالک اور قومیتوں کے حسن اور بوقلمونی کا گلدستہ ہوتا اگر چہ ہندوستانی عورتوں کا غلبہ ہوتا۔ ان کی وجہ شہرت ان کا حسن، نزاکت، اور وفور نسوانیت ہوتا۔ امیر خسرو کے زمانے سے قرون وسطی کے بہت سے شعرا ان کی دلکشی اور دلربائی کے قصیدہ خوانی کرتے رہے ہیں۔ ایسا ہی اہل فرنگ نے بھی کیا۔ اور مے نے دیگر لوگوں کے علاوہ اس بات کی پرزور تائید کی ہے کہ ''یوں لگتا ہے جیسے قدرت نے پورے ہندوستان کی عورتوں پر حسن کی بارش کر دی ہو وہ بھی دیگر ممالک کے مقابلے میں بڑی فیاضی سے۔'' (67)۔ ان کی جاں نثاری اور لگن ان کی دلربائی کی ہم پلہ ہیں۔ حرم میں ایسی رسوم و آداب کی پابند مخلوق ایک اثاثہ سمجھی جاتی اور اگر ان کی تعداد کثیر ہوتی تو بھی خیر مقدم کیا جاتا۔

داشتہ گیری:

کنیز لڑکیوں کو دو اہم فرائض انجام دینے پڑتے امور خانہ داری اور جہاں بھی ضرورت پڑتی ہم بستری۔ قرون وسطی کے مسلم سماج میں کنیزی اور داشتہ گیری قریب قریب ایک ہی اصطلاح کے دو نام تھے۔ صاحب حیثیت کثیر الازدواج مسلم مردوں کے لئے کنیزوں اور خادموں کی اتنی بڑی تعداد میں طلب تھی جتنی کنچنیوں ناچنے والی لڑکیوں کی داشتاؤں کی یا پھر آزاد پیدا ہونے والی عورتوں کی۔ چاہے وہ عام بازار سے خریدی گئی ہوں۔ (68)۔ یا جنگ میں پکڑی گئی ہوں یا دھاووں میں ہاتھ آئی ہوں یا پھر دلہنوں کی خادمائیں بن کر آئی ہوں مختصراً ان کے حرم تک پہنچنے کا کوئی بھی ذریعہ رہا ہو، کنیزیں جو بادشاہوں کے محل میں یا پھر امرا کے دولت کدوں پر آتیں وہ خوش شکل ضرور ہوتیں۔ ان کے چہرے حرم میں ان کا مقام متعین کرتے اور آقا کے دل میں حیثیت۔ کہیں ان میں جنسی کشش بھی ہوتی تو یہ سونے پر سہاگہ ہوتا۔ (69)۔ لیکن جن کے منہ سے بو آتی یا بغل مہکتے انہیں اس لئے نظر انداز کر دیا جاتا کیونکہ ان سے بوس و کنار کرنا اور مساس بھی کرنا ہوتا۔ (70)۔ وہ نہایت نفیس پوشاک پہنا کرتیں۔ ان کے ملبوسات بسا اوقات ان کے آقا یا مالکنیں بطور تحفہ انہیں دے دیتے۔ یہ روایت تھی کہ شہزادیاں کسی جوڑے کو دوسری مرتبہ نہ پہنتیں اور اپنی باندیوں کو دے دیتیں۔ (71)۔ چند پسندیدہ کنیزوں کو آلات موسیقی کی سنگت میں گانا بجانا بھی سکھایا جاتا۔ ان میں سے پیشتر کو اشعار سنانے کی، نغمہ سرائی کی اور غزلیں سنانے کی ترتیب دی جاتی۔ پر فصیح گفتگو کرنے کی عادت، الفاظ کی نشست و برخواست اور عمدہ تلفظ مسلم ماحول میں پروان چڑھنے والی خواتین میں اتنا رچا بسا ہوتا کہ ان کی خادمائیں تک اپنے لب و لہجے سے پہچان لی جاتیں۔ جس مرتبے پر وہ فائز تھیں اس کی مناسبت سے انہیں علم تھا کہ اپنے آقاؤں کے دل کیسے جیتنا ہے جو انہیں خوشنما اور گدگدانے والے نام جیسے گلاب، چنبیلی، کمل، مرگ نین، کیتکی، موتی، دل افروز، مہندی، گل رنگ، کومل، سوگندھا، مدھومتی، سلونی، گل انار، گل اندام، گل رعنا، گل یاسمین، گل بادام، سوسن، کستوری، کیسر، نرگس، چمپا،

PDF created with pdfFactory trial version www.pdffactory.com

ہونہ ہو بچپنے میں مختلف دیہات سے یا پھر مختلف باغی ہندو شہزادوں کے گھروں سے اٹھایا گیا ہوگا۔اس کے باوجود کہ ان کے نام ہندوانہ ہیں تاہم وہ سب مسلمان تھیں۔(72)۔شرعاً ''کسی غلام یا باندی کا کافر ہونا ایک عیب سمجھا جاتا تھا اس کے علاوہ مسلمان کافروں کی رفاقت اور تعلق رکھنے میں کراہت محسوس کرتے ہیں۔''(73)۔بات واضح ہے کہ مذہب تبدیل کرنے والی کنیزوں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ ان سب کے نام بدل کر مسلم نام نہیں رکھے جاسکتے تھے۔مثلاً اورنگ زیب کے عہد میں بڑی باقاعدگی سے راجپوتوں اور مرہٹوں کی عورتوں اور بچوں کو ہر دھاوے اور یلغار کے بعد غلام بنایا جاتا۔(74)۔یہاں تک کہ کمتر درجہ کے امراتک مذکورہ غلام سازی میں بے لگام ہو چکے تھے۔سیدی یعقوب،جنجیرہ یا زنجیرہ (یہاں مراد سیاہ فام افریقی) نے ایک مرتبہ مرہٹہ قلعہ کو فتح کرلیا جس میں اسے سات سو افراد ہاتھ آئے۔اپنے وعدہ کے باوجود کہ وہ تمام چھاؤنی والوں کو پناہ دے گا۔''اس نے بچوں اور خوبصورت عورتوں کو غلام بنالیا اور جبراً انہیں مسلمان بھی بناڈالا۔۔۔مگر تمام مردوں کو تہ تیغ کردیا۔(75)۔

فرانکو پلسیارٹ کسی امیر کے حرم میں جنسی سرگرمیوں کے متعلق ایک مجمل حال بیان کرتا ہے اور اس میں کنیزوں کا عمل دخل کتنا تھا۔وہ رقمطراز ہے۔''ہر شب امیر کسی مخصوص بیوی کے ساتھ بسر کرتا ہے یا محل کے ساتھ اور وہ خاتون اور اس سے وابستہ کنیزیں جو اس رات کے لئے خصوصی پوشاک زیب تن کئے ہوتی ہیں۔۔۔اگر موسم گرم ہو۔۔۔تو وہ اس کے جسم کی مالش گھسے ہوئے صندل اور عرق گلاب سے کرتی ہیں۔پنکھے دھیمے دھیمے جھلے جاتے ہیں۔چند غلام آقا کی ہتھیلیوں اور تلوؤں کو سہلائے جاتے ہیں،چند ایک بیٹھ کر گاتے ہیں یا ساز بجا کر ناچتی ہیں یا کوئی اور دل بہلانے والی سرگرمیاں کرنے لگتی ہیں جب کہ بیوی ہمہ وقت امیر کے پہلو سے لگی بیٹھی رہتی ہے۔تب کہیں جا کر اسے کوئی حسین خواص بھا جاتی ہے وہ اسے بلاتا ہے اور لطف اندوز ہونے لگتا ہے،اس کی منکوحہ جرأت نہیں کرسکتی کہ کسی قسم کی ناخوشی ظاہر کرے لیکن یہ اس کی عیاری ہے اور بعد میں وہ کنیز سے اچھی طرح نمٹے گی۔(76)۔لیکن بیوی نہ تو اسے برخواست کرسکتی اور نہ ہی اس سے نجات پاسکتی ہے اور نہ فروخت کرسکتی ہے۔اسلامی قانون کے مطابق بیوی شوہر سے جھگڑ سکتی ہے یہاں تک کہ لعنت ملامت کرسکتی ہے لیکن اسے یہ اختیار نہیں ہے کہ اسے آزاد کردے یا جان چھڑالے۔(77)۔غلام یا کنیز کو آزاد کرنا یہ سہولت صرف آقا کو حاصل ہے۔

لیکن چند خصوصی حالات میں جس میں کسی ملازمہ کے حسن یا چاپلوسی سے مالکہ میں حسد کا جذبہ جاگتے لگتا تو وہ اس سے بدسلوکی پر اتر آتی۔کسی کنیز کی زندگی مصائب سے عاری نہ ہوتی۔ان حالات میں باندیاں اور خواص دونوں ہی مالکہ کی ہم جولی ہوتیں۔آفت کی ماری مالکہ کنیزوں کے سامنے دل چیر کر رکھ دیتیں اور کنیز اپنے دکھوں کا درماں آخر الذکر کے مشوروں میں تلاش کرتیں۔جوان اور خوبصورت لڑکیاں خواہ بیگمات ہوں یا خواص یہی آرزو کرتیں کہ شادی ہوجائے۔اور شادی کوئی ایسا درنہ تھا جوان پر بند ہو۔کوئی بھی کنیز لڑکی اپنے آقا کی اجازت سے بیاہی جاسکتی تھی۔اگر کوئی آقا اپنی خادمہ کو دل دے بیٹھتا تو وہ اس سے اپنی بیوی ہی کی طرح پیش آتا۔کنیزوں کو ان کے آقا بڑی بے تکلفی سے بدل لیتے۔شہزادہ اورنگ زیب نے کس عجلت سے اپنی داشتہ چھتر بائی کے عوض ہیرا بائی کو حاصل کرلیا جس کی محبت کے جنون میں وہ مبتلا ہوگیا تھا۔(79)۔بیگمات جیسے ممتاز محل اور نور جہاں نے انگنت کنیزوں کی شادی لائق مردوں سے کر کے رخصت کردیا۔(80)۔لیکن سب ہی اتنی خوش قسمت نہ تھیں اور بہت سی کنیزیں ایسی بھی تھیں جو بر کے انتظار میں بیٹھی رہیں۔مانکسی لکھتا ہے کہ ان میں سے چند ایک کو بے خوابی،واہموں اور ہیسٹریا کے عارضے لاحق تھے اور شادی ہوجانے سے انہیں ''مکمل شفا'' (81) ہوگئی،مانکسی نے کئی خواصوں کی شادی کرانے میں مدد کی۔

مگر سب ہی کنیزوں کی شادی نہ ہوسکی حالانکہ وہ پکڑ کر نہ آئی تھیں بلکہ یا تو خریدی ہوئی یا پھر شادی کے وعدے پر ورغلا کر لائی گئی تھیں۔وہ وہاں اس لئے مسلم حرم میں مقیم تھیں کہ وہ آقا کی خدمت کریں اور آقا جب چاہیں ان سے لطف اندوز ہوں۔انہیں فروخت کرنے کے علاوہ تقسیم کیا جاسکتا یا پھر ان کے بدلے اور کنیزیں لی جاسکتی تھیں۔اس لئے ان میں سے زیادہ تر نہایت ناخوش رہتیں۔اور وہ کوئی نایاب ذی نفس نہ تھیں۔تازہ کھیپ کے آجانے یا پھر رقیبوں کی آمد سے ہمیشہ پرانی والی بدل دی جاتیں۔یوں تحفظ ذات کی خواہش سے وہ ہمیشہ مغلوب رہتیں۔تخت نشین کے بدلنے کا مطلب ایک نئے آقا کی آمد ہوتا۔اگر اور جب کوئی حکمران یا امیر جاہ و اقتدار سے محروم ہوتا تو کنیزیں اپنی حفاظت کی خود ذمہ داری ہوتیں اور پناہ گاہ تلاش کرتیں۔ایسے ہی منظر نامہ کی ایک مثال ہم کہیں اور دے آئے ہیں جس کا تعلق معروف سید برادران کے سید عبداللہ خان کے حرم کی کنیزوں سے تھا۔(82)۔عبداللہ خان کے اقتدار سے زوال کے ساتھ ہی''جب ۱۷۲۰ء میں اس کی اسیری کی خفیہ خبر دہلی پہنچی،اس کی عورتیں جن کی ایک بہت بڑی تعداد اس نے اپنے گرد جمع کرلی تھی ہراساں ہوگئیں: جن میں سے کئی اعلیٰ نسب تھیں،اپنے مستقر پر ہی رہیں،لیکن ان میں سے بہت سوں نے ہوا کا رخ دیکھتے ہی اور شاہی محافظوں (جو انہیں کہیں دور اس وجہ سے لے جاتے کہ وہ لاوارث ہوچکی تھیں) کے آنے سے پہلے ہی ہر اس چیز پر قبضہ کرلیا جو ان کے ہاتھ لگی انہوں نے پرانے برقعوں اور بوسیدہ چادروں اور نقابوں سے خود کو ڈھانپ لیا اور رفو چکر ہوگئیں۔''(83)۔یہ روایت خفی خان نے بیان کی ہے۔میر غلام حسین خان جو سیارالمتاخرین کا مصنف ہے وہ بھی اسی صورتحال کے چند اور گوشوں پر روشنی ڈالتا ہے اور اس لئے اس کی دی ہوئی تفصیلات کا حوالہ دیا جانا ضروری ہے۔''عبداللہ خان کے خاندان کی بیگمات'' وہ رقمطراز ہے''ایسا نہیں ہوا کہ انہوں نے اپنا گھر چھوڑ دیا ہو،وہ اپنے شبستانوں میں رہیں اور سر سے پیر تک شائستگی اور شرم و حیا کی چادر اوڑھے رہیں،ایک دایرے میں بیٹھ کر رونے لگیں۔ان سے کسی نے بھی وہاں پر طاری اندوہناک ماحول سے کہیں اور جانے یا پھر فرار ہونے کو نہ کہا۔۔۔لیکن چند کم مرتبہ خواتین نے اس افراتفری سے فائدہ اٹھا کر ہر وہ چیز اٹھالی جو ان کے ہاتھ آئی اور باپردہ ہونے کے سبب چرا کرلے گئیں۔وہ میلے کپڑے اور عام نقاب پہنے ہوئے تھیں۔اس سے پہلے کہ سرکاری افسران کے ذہن میں سیدوں کے محل کا ساز و سامان آتا وہ روپوش ہوچکی تھیں۔ان میں سے چند عورتوں کو بعد میں پولیس افسران نے تلاش کرلیا مگر دیگر فرار ہونے میں کامیاب ہوگئیں۔۔۔کسی عبداللہ خان کو جو ایران کے کاشان علاقے کا رہنے والا تھا اسے ہمارے عبداللہ خان نے اپنا قدیم دوست اور آقا سمجھ کر یہ ذمہ داری سونپی تھی کہ وہ اس کے حرم سرا کا خیال رکھے،اس نے جوں ہی اس آفت کے متعلق سنا جو اس کے مربی پر نازل ہوئی تھی۔وہ معزز عورتوں کی عفت اور عزت کی پرواہ کئے بغیر حرم میں داخل ہوا اور تمام پسندیدہ اشیاء اور افراد کو لے اڑا۔۔۔(84)۔

مندرجہ بالا قصہ صحیح صحیح یہ بتاتا ہے کہ مسلم حرم کے اندر عورتوں مردوں اور غلاموں کا کیا کردار ہوتا تھا۔خوشحالی کے زمانے میں ہر چیز ٹھیک ٹھاک رہا کرتی۔جب مصیبت

PDF created with pdfFactory trial version www.pdffactory.com

عورتوں کے بھاگنے کے ساتھ ہی معتمد غلام جنسکاری میں دھڑلے سے غوطہ زن ہونے لگتے۔(85)۔

ہیجڑے:

اٹھارہویں صدی کے آغاز ہی میں مسلم حکمرانی زوال کی راہ پر چل پڑی۔ شاہی اور امرا کے حرموں میں مالیاتی توڑا توڑی ہونے لگی۔ ان مقتدروں میں بہت سی کنیزیں اس افلاس کی تکالیف نہ جھیل پاتیں اپنے محلات اور حویلیوں کو چھوڑ کر شہروں میں گھر لے کر اپنی کفالت کرنے لگتیں۔ اسی طرح ہزاروں ہیجڑوں یا خواجہ سراؤں نے اس وقت کوچہ گردی شروع کر دی جب انہیں ان کی خدمات سے سبکدوش کر دیا گیا یا فاقہ کشی نے ان کے دروازوں کو کھٹکھٹانا شروع کر دیا۔(86)۔

ان کی مساعی میں جو انہوں نے اپنے ذریعہ معاش مہیا کرنے کے لئے کیں بہت سی لڑکیوں نے ناچنے والی لڑکیوں کا پیشہ اختیار کیا اور جسم فروشی کے علاوہ سینکڑوں خواجہ سرا جنہیں بے روزگار کر دیا گیا وہ بھانڈ اور ہیجڑے بن گئے۔ جسم فروشی کا تو دنیا بھر میں رواج ہے لیکن ہیجڑے ایک خالص ہندوستانی مظہر ہے۔ بنیادی طور پر اور تاریخی حقائق کے مطابق یا تو وہ قرون وسطی کے خواجہ سراؤں کے ''وارث'' ہیں یا پھر ان کا سلسلہ ان ہی سے ملتا ہے۔

سلطان قطب الدین مبارک شاہ (۱۳۱۶ء۔۱۳۲۰ء) ایک مثالی اور مکمل ہیجڑہ تھا۔ وہ کبھی کبھی زنانہ پوشاک زیب تن کرتا جن میں کڑھائی کا کام ہوتا اور جھالریں ٹنکی ہوتیں اور جواہر سے مرصع ہوتا اور وہ اسی طرح ناچتا ہوا امرا کی حویلیوں میں داخل ہو جاتا۔ جیسا کہ ہیجڑے کرتے ہیں۔ اسی طرح حسن کا نگو جو مالا بار کا حکمران تھا دربار (دربار عام) میں اکثر عورتوں کی طرح کے کپڑے پہنے آ جاتا۔ وہ اپنے بازوؤں اور گردن کو زیورات اور گہنوں سے لدا پھندا رکھتا اور اپنے امیروں سے فرمائش کیا کرتا کہ وہ اس سے اغلام بازی کیا کریں۔(87) مختصراً قطب الدین اور حسن کانگو نے ہیجڑوں کے بے ہودہ پن اور بے لگام رویے کو پوری برہنگی سے پیش کیا۔

مسلم سماج جس میں جہاں کثیر الازواجی رائج تھی وہاں کچھ مردوں کے پاس ایک سے زیادہ بیویاں ہوتیں اور بہت سے ایسے بھی ہوتے جو بن بیاہے رہ جاتے۔ جس سے آخر الذکر کو تحریص ہوتی کہ جب بھی ممکن ہو لڑکیوں کو اغوا کر کے کنیز بنائیں اور بے ریش لڑکوں (امردوں) اور ہیجڑوں سے اغلام بازی کریں۔ یوں ضرورت اور کجروی کے اتحاد نے ہیجڑوں کی کثرت پیدا کرنے میں ہاتھ بٹایا۔ اس کا کما حقہ بیان دہلی کے ایک مختصر خسرہ بنام مرقع دہلی میں ملتا ہے جسے درگاہ قلی خان نے اپنے دورہ دہلی (۱۷۳۸ء۔۱۷۳۹ء) میں اس کے گلی کوچوں میں گھوم پھر کر دیکھ کر لکھا تھا۔ چودہویں صدی کی طرح اٹھارہویں صدی میں شہر دہلی میں کوئی بھی یہ دیکھ سکتا تھا کہ اوباش گنہ گاروں کی چھوٹی سی دنیا میں ناچتے امرد پنی دلی آرزو کے لئے لوگوں کو پرچار رہے ہیں۔ امردوں کی اس زمانے میں اتنی ہی طلب تھی جتنی خانگیوں کی۔(88)۔ مغل شہنشاہیت کے انحطاط اور اس کے بعد ہیجڑوں نے خود کو دہلی اور آگرہ شہروں ہی تک محدود نہ رکھا۔ وہ طول و عرض میں پھیل گئے بلکہ خصوصاً ان مقامات میں جہاں مغل خاندان کے چشم و چراغ یا ان کے صوبیداروں نے خود مختار ریاستیں قائم کر لی تھیں جیسے اودھ یا حیدر آباد دکن۔ ہیجڑوں کی ایک معقول تعداد لکھنو اور حیدر آباد میں آباد تھی، اسی طرح، بمبئی ایسے شہروں میں جہاں مخلوط تہذیب اور مسلمانوں کی ایک معقول تعداد پائی جاتی ہے۔

بدنصیب ہیجڑے جو مسلم غلامی کے نظام کی باقیات ہیں اب بھی ہندوستانی سماج میں ایک مہلک اور طفیلی کردار ادا کر رہے ہیں۔ ان کے بطور عطیہ جارحانہ مطالبات انہیں نفرت انگیز بناتے ہیں۔ مسلم غلامی کے نظام کے کئی اور بھی منفی گوشے ہیں جن میں ہیجڑے غالباً بدترین ہیں۔ لیکن قرون وسطی میں ہیجڑے مسلم سماج کے ایسے لاینفک جزو تھے جیسے کوئی اور حصہ۔ دہلی اور اس کے گردونواح میں بہت سے روضے ہیں جنہیں گنبد کہا جاتا ہے جو سید اور لودھی عہد کے ہیں۔ یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ وہاں بڑے خان کا گنبد ہے (برج اور مقبرہ) چھوٹے خان کا گنبد، دادی کا گنبد اور پوتی کا گنبد، اس کے علاوہ وہاں پر مشہور ہیجڑہ کا گنبد بھی ہے۔(89)۔

PDF created with pdfFactory trial version www.pdffactory.com

مکرر آنکہ

ہم نے تھومس، پیٹرک، ہیوز کا حوالہ دے کر شروع کیا تھا کہ وہ کہتا ہے ''اسلام میں غلامی۔ عائلی قوانین، قانون فروخت اور قانون وراثت باہم گندھے ہوئے ہیں۔۔۔اور اس کی منسوخی مسلم عقائد کی پوری عمارت کی بنیاد پر وار ہوگا۔(۱)۔ یہ بیان آج بھی اتنا میں اٹل ہے جتنا کہ اسلام کے ابتدائی برسوں میں رہا ہوگا۔ اسلام کی حکمرانی تمام عرصے میں یکساں رہی ہے کیونکہ اسلام نہ بدلا ہے اور نہ بدلنے والا ہے۔ جیسا کہ اشتیاق حسین قریشی نے کہا ہے'' کہ مسلم ماہرین قانون اور اہل شریعت شرکی بالادستی کو مانتے نہیں اور معتقد ہیں کہ یہ دایمی اور اپنے جوہر میں ناقابل تغیر ہے۔ اس عقیدہ کا دارومدار قرآن پر ہے ہر مسلمان مانتا ہے کہ یہ کلام الٰہی ہے جو پیغمبرؐ پر نازل ہوا تھا۔ پیغمبرؐ صاحب بھی وحی کو بدل نہیں سکتے تھے۔'' (2)۔ محمدؐ وحی کو بدل نہ سکتے وہ صرف بیان کر دیتے اور تفسیر بیان کر دیتے تھے۔ اور یہی آج تک مسلمان کر رہے ہیں۔ آزاد خیال مسلمان بھی ہیں اور قدامت پسند بھی، ایسے مسلمان بھی ہیں جو فقہ اور شرع جانتے ہیں اور غیر تعلیم یافتہ بھی۔ وہ بحث کرتے ہیں۔ تفسیر کرتے ہیں اور عقلی توجیہہ تاویل بھی کرتے ہیں لیکن سب ہی اسلام کے تنگ دائرے میں گھومتے رہتے ہیں۔ اس کا کوئی امکان نہیں دکھائی دیتا کہ اسلام کے مسلمات میں سے نکلا جا سکے۔ نہ کوئی ایسی گنجائش نظر آتی ہے کہ کسی جدت کو متعارف کرایا جائے۔ اس لئے مسلم غلامی کے نظام کو قرون وسطی تک مرکوز نہیں رکھا جا سکتا۔ محمدؐ کے لئے قرآن نے غلامی کو جائز قرار دے دیا اس لئے اسے اسلام کے مطابق تسلیم کرنا پڑے گا۔ غلامی تو اسلام کا جزو لاینفک ہے۔

ایسا ہو جانے پر مسلم علماء اور اہل فقیہہ اس ادارہ کی زبردست مذہبی پشتیبانی کرتے ہیں۔ بقول برنارڈ لیوس کے'' وہ ایک ایسے ادارہ کی تائید کر رہے ہیں جس کی صحائف نے اجازت دی تھی اس کے علاوہ روایت اور قانون نے اور وہ بھی ایسا جو ان کی نگاہ میں مسلم حیات کے سماجی ڈھانچے کی نگہداشت کا ضامن ہے۔ مثلاً ۱۸۵۵ء میں عثمانی خلیفہ نے اپنے تمام قریب اور دور کے صوبیداروں کو احکام بھیجے کہ غلاموں کی تجارت بند کر دی جائے۔ لیکن حجاز صوبہ کے سرکش عربوں کی نظروں میں یہ قطعاً ایک غیر اسلامی اور مغربی خیالات کے اثر میں اختیار کیا جانے والا طریقہ تھا۔ اسی کو بنیاد بنا کر وہ ترک حکمرانی کا جوا اتار پھینکنے پر غور کرنے لگے۔ ایک عرب رہنما شیخ جمالؔ نے ایک قانونی فیصلہ جاری کیا۔'' جس میں غلاموں کی تجارت پر پابندی کی بالاعلان مذمت کی کہ یہ اسلام کے مقدس قانون کے خلاف ہے۔ اس خلاف اسلام قانون کی وجہ سے، انہوں نے کہا۔۔۔ ترک مرتد اور بے دین ہو چکے ہیں۔ اب انہیں قتل کر دینا جائز تھا قاتل پر نہ تو قانونی گرفت ہوتی اور نہ ہی خون بہا ان کے بچوں کو غلام بنانا بھی جائز تھا۔'' عثمانی ترکوں کو اپنے جنوبی باغیوں کو کچلنے میں وسط ۱۸۵۶ء میں کامیابی ہوئی۔ لیکن بطور مصالحتی اقدام کے تاکہ مزید علیحدگی کی تحریکوں کا سدباب کیا جا سکے۔ ترک حکومت نے غلاموں کے تاجروں کو بڑی بڑی مراعات دیں جنہوں نے عرصہ دراز سے بحیرہ احمر اور حجاز سے افریقی غلاموں کو مشرق وسطی میں لانے کا مرکزی راستہ بنا رکھا تھا۔ سلطان کی حکومت نے اپنے ۱۸۵۷ء کے فرمان سے صوبہ حجاز کو مستثنیٰ قرار دے دیا جس کے ذریعے پوری عثمانیہ سلطنت میں سیاہ فام غلاموں کی تجارت کو غیر قانونی قرار دے دیا گیا تھا۔ یہاں تک کہ ۱۹۶۰ء آ پہنچا جب لارڈ شیکلٹن نے دارالامرا کو بتایا کہ مکہ آنے والے افریقی مسلمان زائرین وہاں پہنچنے پر اب بھی غلام فروخت کرتے ہیں'' انہیں بطور ٹریولر چیک کے استعمال کرتے ہیں۔'' (3)

آج بھی سیاہ فام غلاموں کو سوڈان اور موریطانیہ جیسے ممالک میں خریدا اور بیچا جاتا ہے۔ اسلام کا قانون برائے غلامی کا گہرا تعلق اس ناگزیر عقیدہ سے ہے جو ماننے والوں اور بے دینوں سے ہے۔۔۔ اور مظاہر پرستوں کو باقاعدگی سے غلام بنانے کے لئے بیچا جاتا تھا اگر وہ بدنصیبی کے باعث مسلمانوں کے ہتھے چڑھ جاتے۔(4)۔ یہ بات مصدقہ ہے کہ پندرہویں صدی کے آغاز سے مسلمان سیاہ فام غلاموں کو بردہ کے یورپین تاجروں کو فراہم کر رہے تھے۔ کم از کم وہ تمام کالے غلام جنہیں سیاہ افریقہ سے برآمد کیا جاتا تھا ان میں سے ۸۰% کاروبار مسلمانوں کے ہاتھ میں تھا۔ ان غلاموں کا ایک بڑا حصہ جنہیں امریکہ روزانہ کیا جاتا انہیں بھی مسلم 'غلام پکڑنے والوں' ہی سے خریدا جاتا۔(5)۔ غلامی جہاں تک اس کا وجود قانون کے تحت ہے۔ ہندوستان میں اسے ایکٹ ۵ مجریہ ۱۸۴۳ء کے ذریعے منسوخ کر دیا گیا تھا۔ مگر حتمی ضرب اس پر یکم جنوری ۱۸۶۲ء کو لگی جب تعزیرات ہند کی وہ دفعہ جو اس مسئلے سے تعلق رکھتی تھی حرکت میں آ گئی۔(6)۔ تاہم قابل توجہ نکتہ تو یہ ہے کہ لاکھوں مسلم برقعہ پوش خواتین غلامی کی زندگی بسر کرتی ہیں اور انہیں مرد مقفل دروازوں کے پیچھے رکھتے ہیں اس کے باوجود یہ سمجھتے ہیں کہ غلامی ان کے مذہب اور سماجی زندگی کا حصہ نہیں ہے۔ برقعہ اب بھی غلامی کی علامت ہے، اس کے نفاذ کو یقینی بنانے کی ذمہ داری اب عسکریت پسندوں نے لے لی ہے۔ السید الاشوآنی معروف مصری مصنف اور چیف جسٹس نے اپنے حالیہ بھارتی دورہ میں فرمایا۔'' اگر عورتیں نقاب نہیں اوڑھتیں تو انہیں الگ کر کے یہ یقینی بنایا جا سکتا ہے کہ اب وہ عقیدہ کے تحت نہ سہی خوف سے پہننے لگیں۔۔۔ عورتیں اب اپنی حیثیت بطور کنیز کے قبول کرنے لگی ہیں۔'' (7)'' اس میں بھی اب کوئی شک نہیں ہے کہ ہزاروں غلام آج بھی عرب کے امیر محلوں میں خدمات انجام دے رہے ہیں اور آئے دن یہ سننے میں آتا ہے کہ ملائیشیاء، سری لنکا، ہندوستان وغیرہ کی لڑکیاں شیوخ سے شادی کر کے خلیجی ممالک میں رہ رہی ہیں، ان کی حیثیت کسی حالت میں کنیز لڑکیوں سے بہتر نہیں ہے۔

PDF created with pdfFactory trial version www.pdffactory.com

سامراج کی غلامی

محمد مظاہر

۱۔ غلامی کی تین قسمیں ہیں جسمانی غلامی جو بیسویں صدی میں تقریباً ختم ہو چکی ہے مگر کہیں کہیں اس کے آثار اب بھی پائے جاتے ہیں۔ دوسری قسم 'باضابطہ فہرست' (Indentured) والی لیبر غلامی تھی جو (۱۸۲۶ء۔۱۹۲۹ء) تک موجود رہی تیسری قسم سامراج یا استعمار کی فکری غلامی ہے۔ جسمانی غلامی کو کمپنی حکومت نے ۱۸۴۳ء میں ختم کرنے کا آغاز کیا مگر آخر الذکر فکری/ذہنی غلامی جو اٹھارہویں صدی کے آخری دنوں میں شروع ہوئی تھی وہ اب بھی موجود اور جاری ساری ہے۔ چونکہ اس کی شناخت دشوار ہے اس لئے نجات مشکل تر ہے تاہم اکیسویں صدی میں ہمیں کبھی کبھی اس سے نکلنے کی مثالیں ملتی ہیں مثلاً بھارتی وزیر جنگ جارج فرنانڈس جب 9/11 کے واقعے کے بعد براستہ نیویارک میکسیکو جا رہے تھے تو بھارتی سفیر کے جتانے کے باوجود موصوف کی JFK پر تعینات عملے نے ایئرپورٹ پر جامہ تلاشی لی۔

چند برس کے کے بعد جب امریکی نائب وزیر خارجہ مسٹر آرمیٹیج دہلی کے ایئرپورٹ پالم پر اترے تو جامہ تلاشی کے بہانے ان کو مادر زاد ننگا کر دیا گیا۔ ان کی اعلیٰ ظرفی کہ انہوں نے دہلی میں پہلا کام یہ کیا کہ سابق وزیر دفاع کے گھر جا کر نیویارک ایئرپورٹ کے حکام کے رویے پر معافی مانگ لی یا جیسے بنگلہ دیش میں بنگلہ کو سرکاری زبان بنایا جا چکا ہے۔ مذکورہ غلامی کیسے سرایت کر گئی اور ہم پر کس طرح مسلط ہے اس کی چند مثالیں ملاحظہ کیجئے۔

۲۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ ہم ہندوستان کو اس وقت تک کیسے فتح کر سکتے ہیں جب تک ہم ان کے روحانی اور سماجی ورثے کو تہس نہس نہیں کر دیتے۔ اس لئے میری تجویز ہے کہ ان کے قدیم نظام تعلیم اور تہذیب وتمدن کے قاعدوں اور سانچوں کو بے دست و پا کر دیا جائے۔ جب ہندوستانیوں کو یہ احساس ہونے لگے گا کہ انگریزی زبان ان کے لئے مفید ہے تو وہ بلا کہے اپنے تمدن اور تہذیب سے کنارہ کش ہونے کے ساتھ ساتھ عزت نفس سے بھی محروم ہو جائیں گے۔

3. I do not think we will be able to conquer India unless we break their spiritual and social heritage. Therefore I propose that their old system of education and norms of culture should be drastically cut down. when the Indians start to realise that the English language is good for them, they will automatically lose their culture and self respect".

Lord Macaulay, British parliament 2-2-1835.

۴۔ ''نشاۃ ثانیہ (Renaissance) سے شروع ہونے والی ہماری بالادستی کا سبب جزواً سائنس اور سائنسی ہنرمندی رہی ہے اور جزواً سیاسی اداروں کا فروغ ہے جو قرون وسطیٰ سے چیونٹی کی رفتار سے سفر کر کے پایہ تکمیل کو پہنچے ہیں۔ ہمیں اشیاء کی فطرت میں ایسی کوئی چیز نہیں دکھائی دیتی جس سے مذکورہ بالادستی طول پکڑ سکے۔ ان دنوں لڑی جانے والی جنگ میں سویٹ یونین، چین اور جاپان نے عظیم عسکری قوت دکھائی ہے۔ مغربی طاقتوں کی جملہ حربی ہنرمندی اور مشرقی تکنیکی صلاحیت جس میں بازنطینی، کنفیوشس کی دانائی اور شنتو سب شامل ہیں۔ ہندوستان اگر آزاد ہو جاتا ہے تو وہ بھی مشرقی دھنک میں ایک اور اضافہ کرے گا۔ یہ بات کوئی خلاف توقع نہ ہوگی جب اگلی چند صدیوں میں، اگر تہذیب تباہ ہونے سے بچ گئی تو وہ مقابلتاً تنوع کی کہکشاں ہوگی جس کے آگے نشاۃ ثانیہ نژاد تہذیب ہیچ لگے گی۔''

''تہذیب بھی سامراج کی ایک قسم ہے جسے 'حکمراں سامراج' کے مقابلے میں مغلوب کرنا کہیں دشوار ہوتا ہے۔ مغربی سلطنت کے زوال کے کافی عرصے بعد۔ یہاں تک کہ اصلاح دین کا زمانہ آ گیا۔ تمام یورپی تمدن سامراجی رومن ایمپایر کی بھینی بھینی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ مغربی یورپی سامراج جو آج ہم کہلاتے ہیں اسی میں بسے ہوئے ہیں۔ میرے خیال میں موجودہ جنگ کے خاتمے پر اس دنیا میں اگر ہم چونچال رہنا چاہتے ہیں تو ہمیں ایشیا کو اپنے دلوں میں جگہ دینی پڑے گی جو نہ صرف سیاسی ہو بلکہ تمدنی اور تہذیبی بھی ہونا چاہئے۔ یہ شعار اپنے جلو میں کیا تبدیلیاں لائے گا میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ مگر مجھے یقین ہے کہ مذکورہ تبدیلیاں متنوع اور تہ و بالا کرنے والی اور عظیم اہمیت کی حامل ہوں گی۔''

5. "Our superiority since the Renaissance is due partly to science and scientific technique, partly to political insitutions slowly built up during the Middle Ages. There is no reason, in the nature of things, why this superiority should continue. In the present war, great military Strength has been shown by Russia, China and Japan. All these combine Western technique with Eastern ideology--Byzantine, Confucian, or shinto. India, if liberated, will contribute another oriental element. It seems not unlikely that during the next few centuries, civilization, if it survives, will have greater diversity than it has had since the Renaissance. There is an imperialism of culture which is harder to overcome than the imperialism of power. Long after the westren Empire fell--indeed untill the Reformation--all European culture retained a tincture of Roman imperialism. It now has, for us,

PDF created with pdfFactory trial version www.pdffactory.com

culturally. What changes this will bring about, I do not know, but I am convinced that they will be profound and of the greatest importance." Bertrand Russell (History of Western Philosphy P-395- 1946)

۶۔ یہ کوئی پرانی بات نہیں ہے جب روئے زمین پر دو ارب باشندے بستے تھے۔ جن میں پچاس کروڑ تو انسان تھے اور ایک ارب پچاس کروڑ دیسی لوگ، اول الذکر کے پاس الفاظ اور گویائی تھی دیگر محض طوطے تھے۔ ان کے درمیان زرخرید خطاب یافتہ نائٹس، سرداروں کے سردار اور امراء کا طبقہ تھا جو سر تا پا بہروپیے ہوتے جو پھپھڑ دلالوں کے فرائض انجام دیتے۔ نو آبادیوں میں سچ یا حق برہنہ استادہ ہوتا۔ مگر ان خطوں میں جہاں انسان بستے تھے وہ حقائق ملبوس دیکھنے کو ترجیح دیتے۔ لیکن دیسی لوگوں پر لازم تھا کہ وہ ان سے محبت کریں۔ بالکل اسی طرح جیسے لوگ ماؤں کو چاہتے ہیں۔ ژاں پال سارتر۔ ۱۹۶۱ء۔ مندرجہ ذیل کتاب کا پیش لفظ۔

7. "Not so very long ago, the earth numbered two thousand million inhabitants, five hundred million men, and one thousand five hundred million natives. The former had the word, the others had the use of it, Between the two there were hired knights, over Lords and bourgeoisie, sham from begining to end, which served as go ~~-be~~tween. In the colonies the truth stood naked but the citizens of the mother country perfered it with cloths on: The natives had to love them, some thing the way mothers are loved." (preface to "Les de la terre" 1961)

۸۔ ''اس صورت حال کے مقابلے میں مقامی باشندوں کا ردعمل یکساں نہیں ہوتا۔ ایک جانب عوام کا انبوہ مربوط روایات پر قائم رہتا ہے جو استعماری حالت سے بالکل مختلف ہوتی ہے اور دستکاری کے اسلوب جامد ہو کر رسمیت اور یکسانیت کا شکار ہو جاتے ہیں مگر دوسری طرف دانشور مجنونانہ انداز میں بڑے جوش و خروش کے ساتھ قابض قوت کی تہذیب اپنانے میں لگ جاتا ہے اور خود اپنی تہذیب پر معاندانہ تنقید کرنے کا کوئی موقع ضائع نہیں ہونے دیتا یا پھر اسی تہذیب کے دعوؤں کو یکجا کرنے اور ان کی پیشکش میں لگ جاتا ہے جو جذباتی ہونے کے باوجود بڑی تیزی سے غیر تخلیقی اور بنجر ہوتی جاتی ہیں۔''

مندرجہ بالا کتاب کا ترجمہ: (افتادگان خاک۔ ص۔ ۲۱۳)۔ فرانز فینن (اینگلز کے بعد فینن پہلا شخص ہے جس نے تاریخ کی حرکت کو دن کی واضح روشنی بخشی ہے)۔ سارتر

۹۔ ''ہماری فوجوں کو یہ حکم دیا جاتا ہے کہ مفتوحہ ممالک کے باشندوں کو ''بالاتر بندروں'' کے درجہ پر پہنچا دیا جائے تاکہ نو آبادکار کا ان سے بار برداری کرانا جائز قرار دیا جا سکے نو آبادیات میں تشدد کا استعمال محض اس لئے نہیں ہوتا کہ غلاموں کو ایک فاصلے پر رکھا جائے۔ بلکہ مدعا یہ ہوتا ہے کہ ان کی انسانیت ختم کر دی جائے اس بات کی ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے کہ ان کی روایات کو مٹا دیا جائے۔ ان کی زبان کی جگہ اپنی زبان رائج کی جائے اور ان کی تہذیب کو اپنی تہذیب دیئے بغیر برباد کر دیا جائے۔''

پیش لفظ: افتادگان خاک۔ ص۔ ۱۴۔ ژاں پال سارتر، ۱۹۶۱ء۔

۱۰۔ ''خبر یہ ہے کہ برطانیہ کے دو سرکردہ سفارت کار ضلع راولپنڈی کے علاقے مندرا میں ایک ڈیم کے قریب جاسوسی کی سرگرمیوں میں ملوث پکڑے گئے لیکن بعد میں وزارت داخلہ کے حکم پر چھوڑ دیا گیا اور یہ رہائی کسی سفارت کار کے لئے مخصوص پورے پروٹوکول کے ساتھ عمل میں آئی۔ ان کی گرفتاری سے پہلے ان کے قبضے سے جاسوسی کے آلات جن میں کیمرے اور نگرانی والے آلات تھے پکڑے گئے۔ ان سے پوچھ گچھ کرنے پر انہوں نے اپنا تعارف کرایا۔ دونوں برطانوی ہائی کمیشن کے سرکردہ افسر تھے۔ ان سے جب مزید پوچھا گیا تو انہوں نے پاکستانی پولیس والوں کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا کہ ہم نے آپ کو آزادی دی تھی مگر ہم ابھی تک آپ کے آقا ہیں۔ بعد میں وزارت داخلہ حرکت میں آئی اور یہ باعزت رہا کر دیے گئے ان کی بات سچ نکلی۔'' (روزنامہ ایکسپریس کراچی۔ منگل۔ ۱۴ دسمبر۔ ۲۰۱۰ء)

۱۱۔ انسان اس وقت تک آزاد نہیں ہو سکتا جب تک وہ جبر و استبداد کی ماہیت اور کیمیا کو نہ سمجھ لے۔ حوالہ شروع۔

''خلیل جبران کہتا ہے کہ جسے تم آزادی کے نام سے پکارتے ہو۔ وہ دنیا کی زنجیروں میں سب سے زیادہ مضبوط ایک زنجیر ہے۔ اس کی کڑیاں سورج کی روشنی میں چمکتی ہیں اور وہ تمہاری نظروں کو خیرہ کرتی ہیں تو پھر وہ کیا چیز ہے جس کو ترک کر کے تم آزاد ہو سکتے ہو؟ وہ تمہارے ہی وجود کے چند ٹکڑے ہیں۔ اگر زندگی کا وہ قانون جس کو تم منسوخ کر کے آزاد ہونا چاہتے ہو جو غیر منصفانہ ہے اور چاہتے ہو کہ تم اس سے آزاد ہو جاؤ تو یہ بھی یاد رکھو کہ وہ قانون تمہارا ہی مرتب کیا ہوا ہے اور تم ہی نے خود اس کو اپنی پیشانی پر لکھا تھا۔ تم محض قانون کی کتابوں کو آگ لگا کر قانون کو نہیں مٹا سکتے۔ نہ تم اپنے حاکموں کی پیشانیوں کو دھو کر جو کچھ ان پر لکھا ہے اسے مٹا سکتے ہو۔ خواہ تم پیشانیوں کے ان نقوش پر ساتوں سمندر بہا دو! اور اگر تم اس بادشاہ کو تخت سے اتارنا چاہتے ہو جو خود مختار سخت گیر اور ظالم ہے۔ تو پہلے اس کی فکر کرو کہ اس بادشاہ کا وہ تخت جو تمہارے دل کے اندر قائم ہے اپنی جگہ سے ہٹایا جا سکے! اس لئے کہ کوئی ظالم حاکم، اپنی آزاد اور آزادی کی طالب یا آزادی پر فخر کرنے والی رعایا پر حکومت نہیں کر سکتا جب تک کہ خود رعایا کی آزادی میں ظلم کے عناصر کی آمیزش نہ ہو۔'' حوالہ ختم۔

ناول ''النبی'' سے اقتباس۔

PDF created with pdfFactory trial version www.pdffactory.com

PDF created with pdfFactory trial version www.pdffactory.com